قرآنی افکار کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1975

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت
صرف خدا کی ہوتی ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام
میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم
کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔
اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو
علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (قائداعظم [illegible])

مجلہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

شاہکارِ رسالت

عمر فاروقؓ

(اپنے انداز کی منفرد کتاب)

اکثر سوالات ابھرتے ہیں کہ:

- اسلام کا معاشرتی، تمدنی، عسکری، سیاسی، معاشی نظام کیا ہے؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم بھی ہوا تھا؟
- اگر قائم ہوا تھا تو کب؟ اور کس نے قائم کیا تھا؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ:

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا؟
- وہ نظام (الدین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟
- اب پھر سے اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ان سوالات کا نہایت مدلل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا جو مفکرِ قرآن جناب **پرویز** کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

- نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوائے ماموریت اور ختمِ نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے۔

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف۔ سفید کاغذ، مضبوط جلد، جاذبِ نگاہ گرد پوش۔

قیمت: 45/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

[illegible]

[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدل اشتراک
۱½ ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان ۔ ۱۵ روپے غیر ممالک ۔ ۲ پونڈ
شمارہ ۸	اگست ۱۹۷۵ء	جلد ۲۸

فہرست

۱۔ لمعات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲
۲۔ اقبالؒ اور قرآن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰
۳۔ زبان کا مسئلہ (بتقریب یومِ آزادی) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۷
۴۔ نقد و نظر (۱) حیات الحدیث ۔ (۲) دعوتِ ارواح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۴
۵۔ حقائق و عبر (۱) ثقافتِ اسلامیہ کے کچھ نمونے (۲) ہماری تاریخ میں کیا ہے؟
(۳) عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۷
۶۔ باب المراسلات (یہ قصۂ ماضی ہے اسے اب چھوڑ دیجئے) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد ۔ مطبوعہ ۔ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

۱۹۶۲ء کے دستورِ پاکستان کے شعبۂ اسلامیات میں ایک شق یہ بھی تھی کہ ایک ادارہ قائم کیا جائے گا۔ جس کا نام "ایڈوائزری کونسل اوف اسلامک آئیڈیالوجی" (اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل) ہوگا اور اس کے فرائض میں حسبِ ذیل امور شامل ہوں گے۔

۱۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اپنی سفارشات بھیجے کہ مسلمانانِ پاکستان کی زندگی کے ہر گوشے کو کس طرح اسلام سے ہم آہنگ کیا جائے۔۔۔۔ اور

۲۔ حکومت کے دریافت کرنے پر بتائے کہ مجوزہ قانون اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔

چونکہ کونسل کے یہ فرائض نہایت اہم اور محنت طلب تھے اس لئے اس کی معاونت کے لئے ایک تحقیقاتی ادارہ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔

یہ دونوں ادارے ۱۹۶۲ء کے دستور کے نافذ العمل رہنے کے دوران، اور اس کی تنسیخ کے بعد تک بھی قائم رہے (اور اب تک مسلسل قائم چلے آرہے ہیں)۔ اس طویل عرصہ ملنے میں اس کونسل نے کیا خدمات سرانجام دیں، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی نے البتہ کچھ بے مقصد قسم کی کتابیں تالیف کیں اور بعض پرانی کتابوں کے تراجم شائع کئے۔ ملک میں حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے، اجارہ دارانِ اسلام اداروں اور تنظیموں میں سے کسی نے اتنا دریافت کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ یہ کونسل اور ادارہ کیا کام کر رہے ہیں۔ کلنک کا یہ ٹیکا بھی طلوعِ اسلام کی پیشانی کے لئے مقدر تھا کہ یہ وقتاً فوقتاً قوم کی توجہ اس طرف منعطف کراتا رہا۔ اس نقار خانہ میں اس کی یہ صدا بھی طوطی کی آواز بن کر رہ گئی، البتہ اس سے اس نے اپنے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والے عناصر میں کچھ اضافہ کر لیا۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں اس کونسل کے قیام، ہیئتِ ترکیبی اور مقاصد و فرائض مزید وضاحت سے درج کئے گئے۔ مثلاً اس میں کہا گیا ہے کہ:۔

۱۔ جن (کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ پندرہ) ارکان پر یہ کونسل مشتمل ہوگی، ان کے متعلق کہا گیا کہ ان کا تقرر صدرِ مملکت کے انتخاب کی رُو سے ہوگا، اور وہ ایسے افراد ہوں گے جنہیں قرآن و سنت میں بیان کردہ فلسفہ اور اصولِ اسلامی کے متعلق علم و فہم اور پاکستان کے معاشی، سیاسی، قانونی اور انتظامی

مسائل کے سمجھنے کی صلاحیت حاصل ہو۔ ان میں کم از کم دو رکن ایسے ہوں گے جو عدالتِ عظمیٰ یا عدالتِ عالیہ کے موجودہ یا سابق جج ہوں، اور کم از کم چار رکن ایسے جن میں ہر ایک کم از کم پانچ سال اسلامی امور پر تحقیقات یا ان کی درس و تدریس میں مصروف رہا ہو۔

۲۔ یہ کونسل پارلیمان اور صوبائی اسمبلیوں کو ایسی سفارشات پیش کرے گی جن کے مطابق عمل کرنے سے مسلمانانِ پاکستان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی، کتاب و سنت میں بیان فرمودہ اصول و تصورات کے قالب میں ڈھالنے کے قابل ہوں اور اس مقصد کے لئے ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔

۳۔ جس معاملہ کے متعلق کونسل سے استصواب کیا جائے۔ وہ بتائے کہ وہ احکاماتِ اسلامی کے منافی ہے، یا نہیں۔

۴۔ اس امر کی سفارشات کرے کہ ملک کے مروجہ قوانین کو کس طرح ..... اور کس تدریج کے ساتھ احکامِ اسلامی کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔

۵۔ پارلیمان یا صوبائی اسمبلیوں کی راہ نمائی کے لئے ایسے اسلامی احکامات کا ضابطہ مرتب کرے جنہیں قانونی شکل دی جا سکے۔

۶۔ یہ کونسل اپنی تشکیل کے بعد سات سال کے اندر قطعی، اور ہر سال عبوری رپورٹ پیش کرے گی۔ یہ رپورٹ وفاقی حکومت کے ہر دو ایوانات اور صوبائی پارلیمانوں میں بحث کے لئے پیش ہو گی، اور اس کے بعد یہ ادارے انہیں قانونی شکل دے دیں گے۔

یہ ہے ملخص اس کونسل کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کے فرائضِ منصبی کا جو ۱۹۷۳ء کے دستور کے تابع متشکل کی گئی ہے۔ اس دو سال کے عرصہ میں اس کونسل نے کیا کیا فرائض سرانجام دیئے اس کا قوم کو علم نہیں۔ علم ہے تو اتنا ہی کہ جب یہ کونسل، کچھ عرصہ قبل، وفاقی وزارتِ امورِ مذہبیہ کے زیرِ تحویل آئی تو (مولانا) کوثر نیازی صاحب نے اس کی، اور اس کے تابع قائم شدہ تحقیقاتی ادارہ کی کارکردگی پر کڑی تنقید کی۔ کونسل کی دیگر کارکردگی کے متعلق قوم کو علم ہو سکے یا نہ، مذکورہ بالا شق ۶ کی رو سے اس نے جو سالانہ رپورٹیں مرکزی اور صوبائی ایوانات کو پیش کرنی تھیں، کم از کم وہ تو پبلک کے علم میں آنی چاہیئے تھیں۔ ان کے متعلق بھی قوم کو کچھ علم نہیں۔ البتہ حال ہی میں اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان اسمبلی کو یہ رپورٹ بھیجی گئی اور اس نے اس پر غور و خوض بھی کیا۔ ہمارے علم میں یہ خبر، روزنامہ "نوائے وقت" (لاہور) کی اشاعت بابت ۳ جولائی ۱۹۷۵ء کے اداریہ کے ذریعے آئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:۔

> بلوچستان نے اسلامی نظریاتی کونسل کی عبوری رپورٹ برائے ۱۹۷۴-۷۵ء پر عملدرآمد کرنے کا فیصلہ کر کے نہ صرف دوسرے صوبوں کو مقلدین کی صف میں چھوڑ دیا ہے، بلکہ قومی اتحاد و یک جہتی اور پاکستان کی نظریاتی اساس کے استحکام و سربلندی کا یقین افروز اہتمام بھی کیا ہے۔ بلوچستان اسمبلی نے اس کونسل کی عبوری رپورٹ کا جائزہ

لینے کی غرض سے جو پانچ رکنی کمیٹی قائم تھی، اس نے اپنی رپورٹ گذشتہ رمضان ایوان میں پیش کی تھی جسے منظور کر لیا گیا ہے۔

اس خبر سے معلوم ہوا کہ نظریاتی کونسل اپنی عبوری رپورٹ بابت ۱۹۷۴-۷۵ء (کم از کم) صوبائی اسمبلیوں کو بھیج چکی ہے۔ معلوم نہیں کہ کونسل کی یہ پہلی رپورٹ ہے یا اس سے پہلے اس نے ۱۹۷۳-۷۴ء سے متعلق بھی کوئی رپورٹ ان اسمبلیوں کو بھیجی تھی۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ باقی صوبوں (اور مرکزی پارلیمان) نے اس رپورٹ کے سلسلہ میں کیا کارروائی کی۔

قارئین یقیناً منتظر (اور بڑی بے تابی سے منتظر) ہوں گے کہ معلوم کریں کہ ملک کی اس عظیم اور اہم کونسل نے مسلمانانِ پاکستان کی زندگیوں کو اسلامی قالب میں ڈھالنے اور موجودہ غیر اسلامی قوانین کو اسلامی احکامات سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلہ میں کیا سفارشات پیش کی ہیں۔ ہم انہیں زیادہ وقت تک اس انتظار میں نہیں رکھنا چاہتے اور (نوائے وقت کے حوالہ سے) ذیل میں وہ سفارشات درج کئے دیتے ہیں۔

۱۔ اتوار کے بجائے جمعہ کو ہفت روزہ تعطیل قرار دی جائے۔

۲۔ عیسوی کے بجائے ہجری تقویم اختیار کی جائے۔

۳۔ سرکاری تقاریب اوقاتِ نماز کے بعد ہوں یا نماز کے وقت تقاریب کی کارروائی معطل کر دی جائے۔

۴۔ اسلام نے جن اشیائے خورد و نوش کی ممانعت کی ہے ان پر مکمل پابندی۔

۵۔ شلوار قمیص کو قومی لباس (خواتین کے لئے دوپٹہ بھی) قرار دیا جائے۔

۶۔ پاکستانی، شہری، سرکاری تقاریب میں لازماً قومی لباس پہنیں۔

۷۔ رسائل و جرائد اور دیگر ذرائع ابلاغ میں غیر شائستہ اور فحش اشتہارات پر پابندی۔

۸۔ سینماؤں کے باہر اور دوسری عوامی جگہوں پر غیر شائستہ تصاویر کی نمائش پر مکمل پابندی ــــ اور

۹۔ سرکاری تقاریب میں رقص کی ممانعت۔

آپ نے غور فرمایا کہ موجودہ معاشرہ کو، کہ جس میں کوئی چیز بھی اپنی اصل پر قائم نہیں، اسلامی معاشرہ میں تبدیل کرنے، اور مسلمانوں کی زندگی کو دینی قالب میں ڈھالنے کے لئے مملکت کا سب سے بڑا ذمہ دار ادارہ، تجاویز کیا پیش کر رہا ہے؟ ان سفارشات کو دیکھ کر ہمیں افسوس ہی نہیں بے حد صدمہ ہوا، کہ اگر مملکت کے منتخب ترین اربابِ فکر و نظر پر مشتمل ادارہ کی سطحیت کا یہ عالم ہے، تو پھر اس ملک اور قوم کا خدا حافظ۔ پہلے تو ہمیں شکایت تھی کہ یہ ادارہ کچھ کرتے نہیں، لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ اس "کرنے" سے تو وہ، نہ کرنا، ہزار درجہ بہتر تھا کہ،

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ان حضرات کی تحقیق انیق یہ ہے کہ معاشرہ کا سارا بگاڑ، کوٹ پتلون کا پیدا کردہ ہے۔ اگر اس کی جگہ شلوار قمیص پہن لی جائے گی تو ساری بداخلاقیاں دور ہو جائیں گی۔ دروغ بافیاں اور فریب کاریاں، حسنِ عمل میں بدل جائیں گی۔ بددیانتی اور بے ایمانی، دیانت اور امانت میں تبدیل ہو جائے گی۔ عیوب محاسن بن جائیں گے۔ جرائم پیشگی کی جگہ، شرافت لے لے گی۔ غرضیکہ ہماری قوم کی زندگی اسلامی قالب میں ڈھل جائے گی اور معاشرہ، کتاب و سنت کا آئینہ دار

ہو جائے گا۔ کہا جائے گا کہ یہ تو محض آغاز کار ہے۔ اس پروگرام کا قدم اوّل ہے۔ یہ تبدیلی آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ پیدا ہوگی۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ اس قسم کے بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح شاشب نہیں ہو سکتی۔ یہ تبدیلی ہوگا۔ اس میں وقت لگے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لئے قدم اوّل یہی ہوگا کہ کوٹ پتلون کی جگہ شلوار قمیص پہن لی جائے، اور اتوار کی جگہ جمعہ کی چھٹی کی جائے!۔۔۔ کیا موجودہ خرابیوں کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہمارا کاروبار جمعہ کے بجائے اتوار کو بند ہوتا ہے! کیا ہمارے ہاں عام ہونے والی اخلاق سوزیوں اور بے حیائیوں کی علت العلل یہی ہے کہ سینما کی دیواروں پر عریاں تصاویر آویزاں ہوتی ہیں؟ کیا ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ الحاد اور بے دینی کے آغوش میں اس لئے چلا جا رہا ہے کہ ہمارا کیلنڈر گریگوری ہے؟۔۔۔ اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں کہ اصلاح کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہوتا ہے کہ، خرابیوں اور برائیوں کے حقیقی اور بنیادی اسباب کی تشخیص کی جائے۔ جب یہ ہو جائے تو پھر ان کے ازالہ اور اصلاح کے لئے مکمل پروگرام وضع کیا جائے، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ بہ حالاتِ موجودہ آغازِ کار کہاں سے کیا جائے؛ اور کس طرح رفتہ رفتہ اس کے منتہیٰ تک پہنچا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کوئی اصلاحی قدم قیامت تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ خرابیوں اور برائیوں کی جڑ غلط تصوراتِ حیات اور باطل نظریاتِ زندگی کے اندر ہوتی ہے۔ جب تک ان نظریات و تصورات کو نہ بدلا جائے، کسی خرابی کا ازالہ اور کسی برائی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے جب کہا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (۱۳/۱۱) کسی قوم کے خارجی حالات میں تبدیلی نہیں ہو سکتی جب تک اس کے افراد میں داخلی یا نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو، تو اس سے مقصد، نظریاتِ حیات کی تبدیلی ہی سے تھا۔ جس پودے کی جڑوں کو کیڑا لگ گیا ہو، اس کے پتوں پر پانی چھڑکنے سے وہ کبھی ہرا بھرا نہیں ہو سکتا۔ کونسل نے جو سفارشات پیش کی ہیں، اس سے انہیں (عوام کی نظروں میں) سستی شہرت (CHEAP POPULARITY) تو حاصل ہو جائے گی، لیکن قوم میں کوئی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ اصلاح کا طریق بنیادی طور پر غلط، اور حصولِ مقصد کے لئے بیکار ہے۔

اس اساسی اور اصولی گفتگو سے نیچے اتر کر، اگر ان سفارشات پر نگاہ ڈالی جائے جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے تو نظر آ جائے گا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر کی حیثیت قومی شعائر کی ہے، دینی تقاضوں کی نہیں۔ مثلاً :-

(۱) - جمعہ کی تعطیل

ہفتہ میں ایک دن کاروبار بند رکھنا، یہودیوں کا تو "دینی تقاضا" ہے۔ اسلام میں ایسا نہیں۔ ہمارے ہاں یہ قومی سوال ہوگا۔ ہمارا جی چاہے تو ایک دن کاروبار بند رکھیں، نہ چاہے نہ رکھیں۔

اس کے لئے دن کا تعین بھی یہودیوں میں عقیدۃً ہو چکا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بھی نہیں۔ ہم اپنی معاشرتی مصلحت کے ماتحت جونسا دن چاہیں مقرر کر لیں۔ جہاں تک جمعہ کا تعلق ہے۔ قرآن کریم تو اس دن کاروبار کا ذکر کرتا ہے۔ (بلکہ ایک معنی میں) حکم دیتا ہے۔ سورۂ جمعہ میں ہے۔ یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ۔۔۔۔ (۶۲/۹) لیجئے جمعہ

مومنین! جب تمہیں صلوٰۃ الجمعہ کے لئے پکارا جائے تو تم کاروبار چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف لپک کر آجایا کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے کے مسلمان قبل از صلوٰۃ جمعہ کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ جبھی تو ان سے کہنا پڑا کہ کاروبار چھوڑ کر صلوٰۃ کے لئے آجایا کرو۔ اس کے بعد ہے۔ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ..... (۶۲/۱۰) "جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو تم تلاشِ معاش میں اِدھر اُدھر (جہاں جی چاہے) نکل جاؤ"۔ اس سے واضح ہے کہ وہ بعد از صلوٰۃ بھی کاروبار کرتے رہتے تھے۔ بلکہ (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) یہاں کاروبار کی تاکید پائی جاتی ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی ان تصریحات کے مطابق جمعہ کے دن صرف صلوٰۃ جمعہ کے لئے کاروبار بند کرنے کا حکم ہے۔ باقی وقت نہیں۔

بالفاظِ دیگر ہماری اسلامی کونسل نے خیر سے ایک سفارش کی ہے اور وہ بھی قرآنی صراحت کے خلاف ہے۔

(۲)۔ کیلنڈر (تقویم)

کیلنڈر کے متعلق بھی نہ قرآن کریم میں کوئی حکم ہے، نہ ہی موجودہ ہجری کیلنڈر نبی اکرم کا متعین فرمودہ ہے۔ یہ عہدِ فاروقی میں صحابہ رضؓ کے مشورہ سے مقرر کیا گیا تھا، اور چونکہ عربوں کے ہاں قمری حساب رائج تھا اس لئے اسی کو جاری رکھا گیا۔ جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے وہ شمس اور قمر دونوں کو عدد السنین (کیلنڈر) کا مدار بتاتا ہے۔ سورۃ انعام میں ہے۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا (۶/۹۶) "سورج اور چاند دونوں کو حساب رکھنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ (نیز ۵۵/۵) لہٰذا ہم اپنی سہولت کی خاطر شمسی کیلنڈر بھی اختیار کر سکتے ہیں، قمری بھی۔ قمری (چاند کی رو سے) کیلنڈر ان لوگوں کے لئے آسان رہتا ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں — جیسے ہمارے ہاں دیہاتی یا عرب کے صحرا نشین جنہوں نے اسے اپنے ہاں رائج کر رکھا تھا۔ اس میں سقم یہ تھا کہ اس کی رُو سے سال قریباً (۳۵۴) دن کا شمار ہوتا ہے۔ جبکہ شمسی کیلنڈر کی رو سے سال کے قریب (۳۶۵) دن ہوتے ہیں۔ چونکہ زمین سورج کے گرد اپنا چکر تقریباً (۳۶۵) دنوں میں ختم کر لیتی ہے اور موسموں کا تغیر بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے اس لئے فصلوں کے بونے کاٹنے کا حساب بھی اس کی رو سے بسہولت رکھا جا سکتا ہے۔ قمری کیلنڈر کو شمسی کیلنڈر سے ہم آہنگ کرنے کیلئے عرب (بلکہ یوں کہئے کہ دنیا کی دیگر اقوام بھی) کرتے یہ تھے کہ کیلنڈر میں ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر لیتے تھے۔ اس سے (عربوں کے ہاں) ایک اور دشواری پیدا ہوتی تھی۔ ان کے ہاں سال میں چار مہینے ایسے تھے جن میں جنگ بند رکھی جاتی تھی۔ وہاں کے تمدنی حالات کے پیشِ نظر ان مہینوں کا تعین بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مذہبی پیشواؤں نے یہ منصب خود سنبھال رکھا تھا اور ہر تیسرے سال ایک ماہ کے اضافہ کی وجہ سے وہ اس میں بڑی گڑبڑ کر لیتے تھے (مذہبی پیشوائیت کا ہر جگہ یہی شیوہ ہے) قرآن کریم نے ان کی اس روش کو (جسے النسیئ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔) سخت معیوب قرار دیا اور اسے ختم کر دیا۔ اس نے کہا کہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ..... (۹/۳۶) "کائنات کے تخلیقی پروگرام کے مطابق سال کے بارہ مہینے ہی ہونے چاہئیں"۔ اس سے نسیٔ کی رسم کو تو ختم کر دیا گیا، لیکن کیلنڈر قمری مہینوں کے مطابق برقرار رکھا گیا، حالانکہ اس سے سال پورا بارہ مہینوں میں ختم نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قمری سال، شمسی سال

سے دس دن کم رہ جاتا ہے۔

کیلنڈر قومی شعار ہوتا ہے اور اس سے کسی اہم واقعہ یا تصور کی یاد وابستہ ہوتی ہے۔ ہمارے صدر اوّل کی تاریخ میں ہجرت کے ساتھ ایک عظیم انقلاب کی یاد وابستہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس یاد کو زندہ رکھنا چاہیئے۔ (اگرچہ جب اس قسم کی یادیں بھی رسم بن جاتی ہیں تو ان کی معنوی حیثیت بہت کم پیش نظر رہتی ہے۔ جس طرح اب، اور تو اور، ہجری تقویم کو قائم رکھنے اور اس پر زور دینے والوں میں سے بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی معنوی حیثیت کیا ہے) لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جس دنیا میں ہم بستے ہیں اور جن بین الاقوامی معاملات سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے، ان کا تقاضا یہی ہے کہ ہمارا کیلنڈر شمسی کیلنڈر سے ہم آہنگ ہو۔ علاوہ دیگر مصالح، اس سے، سورۂ توبہ کی مندرجہ بالا آیت کے مطابق سال بھی بارہ ماہ میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ایسا کر لیا جائے کہ گذشتہ زمانہ کا حساب تو علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے۔ (یعنی ۱۳۹۵ھ تک سابقہ عرصہ برقرار رکھا جائے) اور آئندہ شمسی سال اختیار کر لیا جائے، اور اسے موسوم ہجری تقویم ہی سے کیا جائے۔ اس سے واقعۂ ہجرت کی یاد بھی قائم رہے گی۔ ہماری گذشتہ تاریخ کا حساب بھی برقرار رہے گا۔ اور آئندہ شمسی اور قمری کا تفاوت بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن ایسا اپنے ہاں کے ان ماہرین کے مشورہ سے کیا جائے جو علم تقویم میں مہارت رکھتے ہوں، اور دیگر مسلم ممالک سے استصواب کے بعد — کیونکہ یہ نہایت ضروری ہے کہ (کم از کم) مسلم ممالک میں کیلنڈر یکساں ہو۔ اسلامی کونسل کو چاہیئے تھا کہ اس قسم کی سفارش ان تمام امور پر غور و خوض، اور مشاورت و استصواب کے بعد کرتی۔ موجودہ سفارش تو محض جذباتی ہے۔ اگر اسے قانوناً تسلیم کر لیا گیا، تو مملکتِ پاکستان کو لامحالہ دو قسم کے کیلنڈر اختیار کرنے پڑیں گے — ایک (قمری) نجی معاملات کے لئے، دوسرا (شمسی) بین الاقوامی تعلقات اور کاروبار کے لئے۔ اور اس سے جو الجھنیں پیدا ہوں گی وہ ظاہر ہیں۔

(۳) سرکاری تقاریب اوقاتِ نماز کے بعد ہوں یا نماز کے وقت اُن کی کارروائی معطّل کر دی جائے

یہ سفارش معقول ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے منفی حد تک کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ مثبت طور پر یہ بھی کہنا چاہیئے تھا کہ جس جگہ یہ تقاریب منعقد ہوں، اگر اس کے قرب و جوار میں کوئی مسجد نہ ہو تو وہاں ادائیگی نماز کے لئے بھی ضروری انتظام کیا جائے۔

(۴) اسلام نے جن اشیاء خورد و نوش کی ممانعت کی ہے اُن پر مکمل پابندی

ایسا کرنا نہایت ضروری ہے۔ لیکن کونسل کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ان اشیاء خورد و نوش کی تصریح کرتی جن کی اسلام نے ممانعت کی ہے۔ یہیں سے تو یہ معلوم ہوتا کہ خود کونسل کا زاویۂ نگاہ کس حد تک اسلامی ہے۔ بلکہ یہ کہ اس کے نزدیک کسی امر کے "اسلامی" اور "غیر اسلامی" ہونے کا معیار کیا ہے؟ مثلاً قرآن کریم نے اشیاء خورد و نوش میں، علاوہ دیگر اشیاء، مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (۵/۳ و دیگر مقامات) کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ معنی اس کے ہیں، ہر وہ چیز جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں وہ نذر و

نیاز شامل ہے۔ جیسے بڑے بڑے بزرگوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جس کا ہمارے معاشرہ میں عام رواج چلا آرہا ہے ـــــ بلکہ اب تو یہ اور بھی شدت اور کثرت اختیار کر رہا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ کونسل کو چاہئے کہ ایسے امور کی سفارش بصراحت کیا کرے، کیونکہ اس کے بغیر اسے عملاً نافذ کرنا ممکن نہیں ہوگا اور ایسا اوقات بہت سی الجھنوں کا موجب بن جائے گا۔

(۵) شلوار قمیص (اور عورتوں کے لئے ان کے ساتھ دوپٹہ) کو قومی لباس قرار دیا جائے، اور

(۶) سرکاری تقاریب میں اس لباس کو لازمی ٹھہرایا جائے

قرآن کریم نے مسلمانوں کے لئے کوئی خاص لباس تجویز نہیں کیا، نہ ہی ایسا ممکن العمل تھا۔ اس لئے کہ لباس کی ضرورت اور تقاضے، مختلف ممالک کی آب و ہوا کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ اس نے لباس کا مقصد یہ کہہ کر بتایا ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا (۷/۲۶) "اے نوعِ انسان! ہم نے تمہارے لئے لباس (جانے کا سامان) پیدا کیا ہے تاکہ وہ تمہارے لئے ستر ڈھانپنے کا ذریعہ اور زیبائش کا موجب ہو۔" اس نے لباس کا یہ مقصد بتایا ہے ـــــ اور وہ بھی تمام انسانوں کے لئے (کیونکہ اس میں تخاطب بنی آدم سے ہے) لہٰذا کسی خاص وضع کا لباس دینی تقاضا نہیں۔ اگر کسی ملک میں بسنے والے مسلمان چاہیں تو اپنے لئے کسی خاص وضع کا لباس تجویز کر لیں۔ تاکہ افراد ملت میں ظاہراً یک رنگی بھی پیدا ہو جائے، اور اگر وہ اسے انفرادی ذوق پر چھوڑنا چاہے تو اس میں بھی (دینی نقطۂ نگاہ سے) کوئی مضائقہ نہیں۔ اس باب میں دیکھنا صرف یہ ہوگا کہ وہ لباس اس مقصد کو پورا کرے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ یعنی ستر پوشی اور زیبائش ـــــ چونکہ نظر بانی کونسل کا وجود اس غرض کے لئے عمل میں لایا گیا ہے کہ وہ معاملہ زیرِ نظر کے متعلق دیکھے کہ وہ اسلام کے خلاف تو نہیں، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ قومی لباس تجویز کرنا اس کے دائرۂ کار سے باہر کی چیز ہے۔ اس کے لئے صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ اگر قوم کوئی خاص لباس اپنے لئے تجویز کرتی ہے تو وہ مندرجہ بالا مقصد کے خلاف تو نہیں جاتا۔

(۷۔ ۸۔ ۹) غیر شائستہ اور فحش اشتہارات اور رقص پر پابندی

یہ سفارش بھی معقول اور برمحل ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے فحش اشتہارات اور تصاویر تک ہی کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس ذریعہ اور سبب پر ہونا چاہئے جو جنسی جذبہ میں انگیخت، ہیجان یا اشتعال پیدا کرے۔ فحش اشتہارات و تصاویر تو اس کی ایک پیش پا افتادہ اور عریاں سی شکل ہیں۔ جس قسم کا عریاں لٹریچر ہمارے ہاں شائع ہو رہا ہے ـــــ وہ نثر میں ہو یا نظم میں۔ وہ غیر ممالک سے درآمد شدہ ہو یا خود اپنے ہاں کی تخلیق ـــــ اس سب پر یہ پابندی عائد ہونی چاہئے اور پھر اس پر سختی سے عمل ہونا چاہئے۔ ہمارے معاشرہ میں جنسی ہیجانات سیلاب کی طرح امنڈے چلے آرہے ہیں اور اس کا سدِباب حکومت کا اولین فریضہ ہونا چاہئے۔ لہٰذا کونسل کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس باب میں ان سفارشات سے کہیں زیادہ جامع

اور مؤثر سفارشات کرتی۔

لیکن ان ظواہر سے کہیں زیادہ تخریب کار اور فساد انگیز وہ بواطن ہیں جو جنسی ہیجان کے محرک ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق نفسیات سے ہے۔ لہٰذا جب تک ہمارے نوجوان طبقہ میں صحیح نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، معاشرہ میں فحاشی کا سدِباب نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر اصلاحی کوششوں کی مثال وہی ہے جسے ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ یعنی اسی پودے کے پتوں پہ پانی چھڑکنا جس کی جڑ کرم خوردہ ہو۔ اسی بنا پر قرآن مجید نے کہا ہے کہ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۷/۳۳) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرے رب نے ظاہر و باطن فواحش، دونوں کو حرام قرار دیا ہے۔" کونسل کے لئے ضروری تھا کہ وہ فحش کے باطنی محرکات کی تحقیق کرتی اور ان کی اصلاح کی سفارشات پیش کرتی۔ کرنے کا اصل کام تو یہی تھا۔ فحش اشتہارات کی مخالفت کے لئے نہ کسی نظریاتی کونسل کی ضرورت تھی، نہ اسلامی تحقیقاتی ادارہ کی۔ یہ تو پیش پا افتادہ موضوع ہے جس کا ہر جگہ چرچا ہوتا رہتا ہے۔

یہ ہیں وہ سفارشات جو نظریاتی کونسل نے مرتب کی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان میں بیشتر ایسی ہیں جن کا دین سے براہِ راست کچھ تعلق نہیں۔ وہ قومی شعائر سے متعلق ہیں۔ جن سفارشات کا دین سے براہ راست تعلق ہے وہ بھی عمومی اور فروعی حیثیت رکھتی ہیں اور "پکی روٹی" والے واعظوں کی طرف سے صبح شام پیش ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں سے کسی کا تعلق دین کی اساس و اصول سے نہیں۔ اس وقت ہمارا معاشرہ تیزی برق رفتاری سے تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف بڑھے چلا جا رہا ہے، اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ بنیادی نظریات نگاہوں سے اوجھل ہو چکے اور گم کئے جا رہے ہیں، جن کے تحفظ و استحکام کے لئے یہ مملکت وجود میں آئی تھی۔ ان نظریات کے الفاظ تو دن رات دہرائے جاتے ہیں، لیکن ان کا متعین مفہوم تک کسی کے سامنے نہیں۔ کونسل کے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ان نظریات کا مفہوم متعین کرے اور اس کی روشنی میں بتائے کہ ان پر عمل پیرا کس طرح ہوا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ بتائے کہ جسے نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے، وہ ہے کیا، اور دو قومی نظریہ کا مفہوم مقصود کیا ہے، اور وہ کونسی دو قومیں ہیں جو پاکستان میں آباد ہیں۔

نظریات سے آگے بڑھئے تو قوم کے سامنے بنیادی مسائل آتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم معاشی مسئلہ ہے جس نے قوم میں عجیب و غریب الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں۔ ایک گروہ سوشلزم ہی کو اسلام قرار دے رہا ہے۔ دوسرا گروہ تنہا سوشلزم نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم کا داعی ہے — نہ سوشلزم کا داعی بتاتا ہے کہ وہ ازم ہے کیا اور کس طرح عین مطابق اسلام ہے۔ نہ اسلامی سوشلزم کے مدعی بتاتے ہیں کہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے؟ اور انہیں سوشلزم کے ساتھ) لفظ اسلام کے اضافہ کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ تیسری طرف ہمارے مدعیانِ اسلام کا گروہ ہے جو سوشلزم کو کفر اور اسلامی سوشلزم کو اس کفر کا فریب انگیز نقاب قرار دے کر دونوں کو ملعون ٹھہراتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس مسئلہ کا واحد حل اسلام کا معاشی نظام ہے لیکن اس نے بھی آج تک یہ نہیں بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا.......... جو انسانیت کے دکھوں کا واحد مداوا ہے۔ کہہ دینے پر وہ زیادہ سے زیادہ زکوٰۃ و صدقات کے الفاظ دہرا دیتا ہے، لیکن نہ دلائل و براہین سے یہ واضح کرتا ہے کہ یہ نظام کس طرح سوشلزم سے افضل و اعلیٰ ہے اور نہ ہی اعداد و شمار سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس

سے کس طرح قوم کے معاشی مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس وقت ساری قوم اس اُلجھن میں گرفتار ہے اور معیشت اس کی دن بدن تباہ ہوتی جا رہی ہے۔ اسلامی کونسل اور تحقیقاتی ادارہ کا اولین فریضہ تھا کہ وہ اس (اور اس قسم کے دیگر بنیادی مسائل) کے متعلق قوم کی رہنمائی کرتے اور واضح اور متعین طور پر بتاتے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور وہ کس طرح اقتصادی مسائل کا واحد اور اطمینان بخش حل ہے۔ لیکن ان اداروں کی حالت یہ ہے کہ یہ کوٹ پتلون کی جگہ قمیص شلوار کی سفارش کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے قوم کی مشکلات کا اسلامی حل دریافت کر لیا۔ ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سوال پر کبھی (SERIOUSLY) غور ہی نہیں کیا۔ (یا اس کا احساس ہی نہیں کیا) کہ ان کی ذمہ داری کیا ہے اور فرائض کیا؟ انہوں نے بھی، باقی قوم کی طرح وقتی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ اگر انہیں اپنے فرائض کا (SERIOUSLY) احساس ہوتا تو اس تیرہ چودہ سال کے عرصہ میں وہ قوم کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیتے اور اس کی علمی اور تحقیقاتی متاع میں ایسا اور اس قدر اضافہ کر دیتے جسے ہم دنیا کے سامنے فخر سے پیش کر سکتے۔ اس وقت (کم از کم ہم تو) اس احساس کے بارِ گراں سے دبے چلے جا رہے ہیں کہ کونسل کی ان سفارشات کو دیکھ کر دنیا کے اربابِ فکر و نظر کیا کہیں گے کہ یہی تھا وہ اسلام جس کے احیاء کے لئے انہیں ایک جداگانہ آزاد مملکت کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔۔۔۔؟

"احمدیوں" کا مسئلہ

"احمدیوں" کا مسئلہ بظاہر حل ہو چکنے کے باوجود، لاینحل چلا آ رہا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اس کی کیفیت سرسام کی تھی، اب تپدق کی سی ہے۔ چونکہ ہماری قوم بڑی جذباتی واقعہ ہوئی ہے اس لئے جب اس کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے تو یہ جھکڑ کی طرح اٹھتی ہے اور جب وہ ہیجان فرو ہو جاتا ہے تو پھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی کہ جس معاملہ کے متعلق وہ اس طرح دیوانہ وار باہر نکلی تھی، اس کا کیا بنا، اور اب وہ کس حال میں ہے؛ قوم کی زود فراموشی کے پیشِ نظر ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ کے پس منظر کو دہرا کر پھر بات آگے چلائیں۔

برسوں کی کش مکش، آویزش، بلکہ فسادات، اور مہینوں کی کد و کاوش، بحث و تمحیص کے بعد، وفاقی پارلیمانِ پاکستان نے گذشتہ ستمبر (۱۹۷۴ء) میں دستورِ پاکستان میں حسب ذیل ترامیم منظور کیں۔

(۱) - جو شخص اس حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا کہ نبوت، سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی آخری کڑی محمدؐ (رسول اللہ) کی ذاتِ اقدس پر مطلقاً اور غیر مشروط طور پر ختم ہو گئی۔ یا جو شخص رسول اللہ کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ خواہ وہ اس لفظ کو کوئی معنی پہنائے، یا کسی رنگ میں مدعیٔ نبوت ہو۔ وہ، اور جو شخص ایسے مدعیٔ نبوت کو نبی یا مذہبی ریفارمر (مصلح) مانے، آئین اور قانون کی رُو سے مسلمان نہیں۔

(۲) - آئین کی دفعہ (۳) ۱۰۶، میں غیر مسلم اقلیتوں کی جو فہرست دی گئی ہے۔ اس میں ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں عیسائیوں وغیرہ کے بعد، ان الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔

جو لوگ قادیانی یا لاہوری گروہ سے متعلق ہوں (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں)

(۳) پارلیمان کی خصوصی کمیٹی نے جو سفارشات تیار کی تھیں ان میں سے دو کو مندرجہ بالا آئینی ترمیم کی شکل میں منظور کر لیا گیا۔ باقی سفارشات حسب ذیل ہیں۔

(ا) تعزیرات پاکستان میں حسب ذیل شق کا اضافہ کیا جائے۔

ختم نبوت کے متعلق آئین میں جو ترمیم کی گئی ہے، جو مسلمان زبان یا عمل سے اس کے خلاف کچھ کہے یا کرے، یا اس کی اشاعت کرے، وہ سزا کا مستوجب ہوگا۔

(ب) آئین کی اس ترمیم کے مطابق الیکشن رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۴ء اور انتخابی فہرستوں سے متعلق قواعد مجریہ ۱۹۷۴ء میں مناسب تبدیلی کی جائے۔ اور

(ج) یہ کہ پاکستان کے تمام باشندوں کی جان، آزادی، جائداد، عزت و آبرو، اور بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا، خواہ ان کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو۔

ہم نے آئین کی اس ترمیم کا جس کی رو سے (لاہوری، قادیانی) "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے، مسرت البساط سے استقبال کیا اور حکومت پاکستان کو اس نہایت مبارک و مسعود فیصلہ پر درخور تبریک و تہنیت قرار دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی وضاحت کر دی کہ اس ترمیم سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ مسئلہ کلیتہً حل ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس فیصلہ کے عواقب میں پیدا ہونے والے مسائل پر غور و خوض کے بعد ان کے حل کے لئے قانونی اقدامات کئے جائیں۔ حکومت کی طرف سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا گیا۔

اس فیصلے پر قادیانی جماعت (جسے اب اہل ربوہ کہا جاتا ہے) کی طرف سے خاموشی اختیار کی گئی — لیکن لاہوری جماعت نے اچھی خاصی دھول اڑانے کی کوشش کی — یہ اس لئے کہ اس (قریب) پچاس سال کے عرصہ میں وہ پہلی بار بے نقاب ہو کر سامنے آئی تھی۔ طلوع اسلام، لاہوری جماعت کی ان مذموم حرکات کا جواب دیتا (اور ان کی طرف سے گالیاں کھاتا) رہا۔ لیکن اسے ربوی جماعت کی طرف سے حقیقی خطرہ کا احتمال تھا — چنانچہ انہوں نے مارچ ۱۹۷۵ء کو اپنی مہر سکوت کو توڑا۔ بات یوں چلی کہ ان کے متبعین نے اپنے سربراہوں سے پوچھا کہ حکومت کی طرف سے مختلف مقاصد کے لئے جو فارم پُر کرنے کو کہا جاتا ہے، ان میں ایک خانہ "مذہب" سے بھی متعلق ہوتا ہے۔ ہمیں بتایا جائے کہ ہم اس خانہ میں کیا لکھیں۔ انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ ہمیں اپنے آپ کو غیر مسلم نہیں لکھنا چاہیئے۔

ہم اپنے آپ کو احمدی لکھ سکتے ہیں، لیکن غیر مسلم نہیں لکھ سکتے۔ اس بات کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ دستور یا قانون کی اغراض کے لئے ہمیں مسلمان نہیں سمجھا گیا، خود ہمیں قانوناً مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے آپ کو غیر مسلم لکھیں۔ یہ جھوٹ ہوگا اور یہ عقلاً، قانوناً اور اخلاقاً بھی درست نہیں اور راست گوئی کے بھی خلاف ہوگا اور یہ امر ہر لحاظ سے واضح اور صریح ہے کہ ہم "احمدی مسلمان" ہی کہلا سکتے ہیں۔ دیگر مواقع پر بھی یہی صورت ہو سکتی ہے۔"

اُن کا یہ اعلان (ان کی جماعت کے ترجمان، روزنامہ الفضل کی ۱۷ ؍ مارچ ۱۹۷۵ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر پورے صفحہ میں نمایاں طور پر) شائع ہوا۔ ہم نے اسے طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۷۵ء کے صفحہ ۲۳ پر من وعن شائع کر کے حکومت پاکستان سے کہا کہ وہ اس نکتہ کی قانونی وضاحت کرے ـــــ یعنی اس نکتہ کی وضاحت کہ جس شخص یا گروہ کو از روئے آئین پاکستان "غیر مسلم" قرار دیا گیا ہو، اگر وہ حکومت کی دستاویزات یا دیگر مواقع پر، اپنے آپ کو "مسلمان" لکھیں، تو حکومت ان کے خلاف کیا کارروائی کرے گی۔

ہم نے اس مسئلہ کو طلوع اسلام میں اشاعت تک ہی محدود نہیں رکھا۔ پہلے محترم وزیر اعظم کی توجہ اس طرف بذریعہ تار منعطف کرائی اور پھر محترم وفاقی وزیر قانون کی خدمت میں تفصیلی خط لکھا۔ ہمیں ان کی طرف سے نہ تو کوئی جواب موصول ہوا۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کوئی اقدامات کئے گئے ہیں ـــ (البتہ مئی ۱۹۷۵ء میں ہمیں وزارت امور مذہبیہ کے تحقیقاتی شعبہ کی طرف سے ایک خط موصول ہوا کہ انہیں ۱۷ ؍ مارچ کے الفضل کی کاپی دستیاب نہیں ہو رہی۔ ہم نے انہیں طلوع اسلام کا وہ پرچہ بھیج دیا جس میں الفضل کا اعلان چھپا تھا۔)

حال ہی میں اخبارات میں شائع شدہ اطلاعات کے مطابق حکومت نے سینیٹ کے ارکان کے حلف نامہ میں حسب ذیل اضافہ کیا ہے۔

> مجھے حضرت محمد مصطفٰے کے آخری نبی ہونے پر غیر مشروط طور پر ایمان ہے، اور میں آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کسی کو بھی جس نے آپ کے بعد پیغمبری کا دعویٰ کیا ہو، پیغمبر یا دینی مصلح نہیں مانتا۔
>
> حلفیہ بیان ہر اس فرد کو کرنا لازمی ہو گا جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا یا اسلام کو اپنا دین مانتا ہو، مگر غیر مسلم امیدوار کی صورت میں یہ اضافہ حذف کر دیا جائے۔
>
> (نوائے وقت ـ ۲۲ ؍ جون ۱۹۷۵ء)

اس کے بعد اخبارات میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ شناختی کارڈ بنوانے والے کو، جو اپنا مذہب اسلام ظاہر کرے، حسب ذیل حلفیہ اقرار کرنا ہو گا۔

> میں حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں خاتم النبیین حضرت محمد مصطفٰے کی ختم نبوت پر مکمل اور غیر مشروط طور پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں کسی ایسے شخص کا پیروکار نہیں ہوں جو حضرت محمد مصطفٰے کے بعد اس لفظ کے کسی بھی مفہوم یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعویدار ہو، اور نہ ایسے دعویدار کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہوں۔ نہ ہی میں قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ سے تعلق رکھتا ہوں۔ نہ خود کو احمدی کہتا ہوں۔
>
> (نوائے وقت ـ ۱۰ ؍ جولائی ۱۹۷۵ء)

شناختی کارڈ کے لئے مطلوبہ حلف نامہ، زیادہ مفصل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسے شناختی کارڈ تک ہی کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ اسے ہر اس مقام کے لئے لازمی قرار دینا چاہیئے، جہاں کسی کو اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ یا

اظہار کرنا مطلوب ہو۔ علاوہ ازیں، کوئی "قانون" جس کی خلاف ورزی کے لئے سزا کا تعین نہ کیا جائے، وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس امر کی تعزیری ضرورت ہے کہ یہ بتایا جائے کہ اگر کوئی غیر مسلم (بالخصوص جسے آئین نے غیر مسلم قرار دیا ہو) اپنے آپ کو مسلمان کہے گا یا لکھے گا یا ظاہر کرے گا تو ایسا کرنا قانوناً جرم ہوگا اور اس کی یہ سزا ہوگی۔ نیز کوئی شخص جو جھوٹا حلف نامہ داخل کرے گا، اس کی یہ سزا ہوگی۔

باقی رہے حلف ناموں کے الفاظ سو مختلف تاویلات و توجیہات کے ذریعے، ان میں سے نکلنے کے جیسیوں راستے تراشے جائیں گے، اور یہ مسائل اس طرح پھر بحث و نزاع کا موضوع بنتے رہیں گے۔ ہم نے اس مقصد کے لئے ایک نہایت سیدھا سادہ اور دو حرفی حلف نامہ تجویز کیا تھا اور وہ یہ کہ جو شخص مسلمان ہونے کا مدعی ہو، وہ مندرجہ بالا قسم کے حلف ناموں کے ساتھ اس امر کا اقرار بھی کرے کہ:۔

"میں مرزا غلام احمد قادیانی کو مسلمان نہیں مانتا۔"

اس سے بات صاف اور دوٹوک ہو جائے گی۔ جب آئین کی رو سے، مرزا صاحب کے متبعین کو غیر مسلم قرار دیدیا گیا ہے تو مرزا صاحب از خود غیر مسلم قرار پا گئے۔ جو شخص انہیں مسلمان مانتا ہے وہ خود مسلمان نہیں رہتا۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ حلف ناموں میں جن اضافوں کو حکومت کی طرف سے ضروری قرار دیا گیا ہے، ان میں تاویلات کے جیسیوں راستے تراش لئے جائیں گے، تو اس کی ایک بیّن مثال ابھی سے ہمارے سامنے آگئی ہے سوسائٹی کی رکنیت سے متعلق حلف نامہ پر گفتگو کرتے ہوئے لاہوری جماعت کے ترجمان "پیغامِ صلح" نے اپنی اشاعت بابت ۱۷ر جولائی میں لکھا ہے کہ:۔

"ہم اس حکم کے دل سے مؤید اور مجوزہ حلف نامہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔"

لیجئے لاہوری جماعت نے ابھی سے اس کی تائید کردی۔ آپ کہیں گے کہ اس جماعت کے لئے اس حلف نامہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ حلف نامہ صرف مسلمانوں سے لیا جائے گا اور لاہوری جماعت کو بروئے دستورِ پاکستان غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس جماعت کے نزدیک یہ بحث ہی پہلے کار ہونی چاہئے کہ حلف نامے کے الفاظ کیا ہیں، لیکن اس سے وہ جس نکتے کو ہوا دینا چاہتے ہیں وہ اس شرط کے اندر پوشیدہ ہے جس سے انہوں نے اپنی اس تائید کو مشروط قرار دیا ہے۔ ان کا پورا فقرہ یہ ہے۔

"ہم اس حکم کے دل سے مؤید اور مجوزہ حلف نامہ کو ضروری سمجھتے ہیں، بشرطیکہ
اس کے ساتھ حلف لینے والے کے لئے یہ بھی لازمی قرار دیا جائے کہ "حضرت عیسیٰ علیہ
السلام کی دوبارہ آمد پر ایمان نہیں رکھتا۔"

ہم تو حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ تشریف آوری کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن اس نکتہ کے پیشِ نظر جسے یہ حضرات اس طرح ابھارنا چاہتے ہیں، ہم اس موضوع پر ذرا تفصیل سے بات کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد پر جہاں عام مسلمان ایمان رکھتے ہیں، وہاں "احمدی" بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ آپ یہ سن کر شاید حیران ہوں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ خود "احمدی" بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں ـــــ حتیٰ کہ ان کے مذہب

کی عمارت ہی اس ایمان پر استوار ہوتی ہے۔ ایمان، عام مسلمان اور "احمدی" دونوں رکھتے ہیں۔ فرق صرف حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد کے طریق میں ہے۔ عام مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسےٰؑ زندہ آسمان پر موجود ہیں، اور وہ بہ جسدِ عنصری (یعنی اپنے جسم کے ساتھ) آسمان سے اتریں گے۔ "احمدیوں" کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسےٰؑ اپنے جسم کے ساتھ آسمان سے نازل نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے مثیل کی شکل میں آئیں گے، اور وہ مثیل میرزا غلام احمد ہیں۔ جو شخص اس مثیل کو نہیں مانتا وہ مسلمان نہیں کافر ہے۔ میرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:۔

> کفر دو قسم کا ہے۔ اوّل کفر یہ کہ ایک شخص اسلام ہی سے انکار کرتا ہے اور آنحضرتؐ کو خدا کا رسول نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے، جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسولؐ نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لحاظ سے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے۔ یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔ (حقیقۃ الوحی۔ صـ۱۷۹) بحوالہ پمفلٹ ردِ تکفیر اہلِ قبلہ مؤلفہ مولوی محمد علی لاہوری صـ۱۳-۱۴۔ ایڈیشن ۱۹۷۰ء)

آپ نے غور فرمایا کہ "مسیح موعود" کی آمد پر ایمان "احمدیوں" کے نزدیک کس قدر اہم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام مسلمان مسیح موعود کے بہ جسدِ عنصری آسمان سے اترنے کے قائل ہیں، "احمدی" ان کے بہ شکلِ مثیل آنے کے قائل۔ ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ حلف نامہ میں جس شرط کو انہوں نے تجویز کیا ہے، اگر اس کے الفاظ حسبِ ذیل رکھ دیئے جائیں تو کیا وہ ان کے نزدیک قابلِ قبول ہوں گے۔

> مَیں حضرت عیسےٰؑ کی دوبارہ آمد پر ایمان نہیں رکھتا۔ نہ بہ شکلِ جسدِ عنصری اور نہ بصورتِ مثیل۔ مَیں مثیلِ مسیح ہونے کے مدعی کو مفتری اور کذاب سمجھتا ہوں۔

اب ذرا آمدِ مسیحؑ کے ان دونوں طریقوں پر بھی غور کیجئے۔ مسلمانوں کا عام عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسےٰؑ آسمان سے بہ جسدِ عنصری نازل ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص (بفرضِ محال) آسمان سے نیچے اتر رہا ہو تو اسے ساری دنیا دیکھے گی۔ جو اس طرح نہیں اترے گا وہ کسی کو یہ دھوکا نہیں دے سکے گا کہ آنے والا مسیح میں ہوں۔

اس کے برعکس جو طریق میرزا صاحب نے بتایا ہے اور جس پر "احمدیوں" کا ایمان ہے، اس میں ہر شخص دھوکا دے سکتا ہے کہ میں "مثیل مسیح" ہوں۔ اگر آج کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ "مثیل مسیح" میرزا صاحب نہیں تھے، میں ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کے گرد بھی کچھ لوگ جمع ہو جائیں گے اور اس طرح وہ بھی امت میں خلفشار پیدا کر سکے گا، جس طرح میرزا صاحب نے کیا۔ بتایئے اگر حضرت عیسےٰؑ کی آمدِ ثانی کا عقیدہ "باطل" ہے تو جس طریقِ آمد کو عام مسلمان مانتے ہیں اس میں نہ کوئی شخص کسی کو دھوکا دے سکتا ہے، نہ جھوٹا دعویٰ کر کے امت میں خلفشار پیدا کر سکتا۔ اس کے برعکس جو طریقِ آمد میرزا صاحب نے بتایا، اس کی رو سے اُمت میں جھوٹے مدعیوں کے لئے ایک اور دروازہ کھل گیا جس میں سب سے پہلے خود میرزا صاحب داخل ہو گئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ حضرات جو مسلسل پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ عام مسلمان آمدِ حضرت مسیحؑ پر ایمان

رکھتے ہیں اور ہم ایمان نہیں رکھتے، کتنا بڑا التباس ہے! اگر حضرت مسیحؑ کی آمدِ ثانی کا عقیدہ باطل ہے تو آسمان سے نزول کا عقیدہ بھی باطل ہے اور مثیلِ مسیح کا عقیدہ بھی باطل۔ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے تو آسمان سے نزول کا عقیدہ، مثیلِ مسیح کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے کہ یہ کسی کے لئے فریبِ دہی کا موجب نہیں بن سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ لوگوں نے ولایت کا دعویٰ کیا۔ مجددیت کا کیا۔ محدثیت کا کیا۔ مہدویت کا کیا۔ نبوت کا کیا۔ حتیٰ کہ الوہیت (خدا ہونے کا) بھی دعوے کیا، لیکن کسی نے مسیحیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس لئے کہ اس میں نزول بہ جسدِ عنصری کی شرط تھی جو کسی صورت میں پوری نہیں ہوتی تھی اس رکاوٹ کو میرزا صاحب نے دور کیا ــــ وہ "مسیح" بھی بن گئے اور آسمان سے اترنا بھی نہ پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اختراع کی انہیں داد ملنی چاہیئے۔ اس سے اگر فریبِ دہی کا دروازہ کھلتا ہے تو کھلا کرے، میرزا صاحب نے اپنا مقصد تو حاصل کر لیا۔

یہ حضرات اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جسدِ عنصری آسمان سے نزول کا عقیدہ خلافِ فطرت ہے اس لئے قابلِ قبول نہیں۔ میرزا صاحب، حضرت عیسےٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا بن باپ کے پیدا ہونے کا عقیدہ خلافِ فطرت نہیں ....؟ پھر یہ کیوں ہوا کہ ایک خلافِ فطرت عقیدہ کو تو صحیح تسلیم کر لیا گیا، اور دوسرے خلافِ فطرت عقیدہ کو قابلِ اعتراض ٹھہرا دیا گیا؟ اس لئے کہ حضرت عیسےٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدہ سے میرزا صاحب کا کوئی ہرج واقعہ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عیسےٰؑ کے آسمان سے نزول کے عقیدہ سے ان کے لئے مثیلِ مسیح بننے کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ لہٰذا میرزا صاحب کے نزدیک وہ عقیدہ قابلِ اعتراض نہیں تھا۔ یہ قابلِ اعتراض تھا۔

اور پھر آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ ان حضرات کا جو یہ دعویٰ ہے کہ میرزا صاحب کی آمد نے "صلیب کو توڑ دیا" (یعنی عیسائیت کو شکست دے دی) تو اس سے صلیب کا کس قدر حصہ ٹوٹا؟ صرف آدھا حصہ۔ باقی حصہ (مولانا) محمد علی نے توڑا، جنہوں نے میرزا صاحب کے پیدائشی حضرت مسیح کے عقیدہ کو رد کرتے ہوئے، ان کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدہ سے انکار کیا، اور یوں جس مقصد کے لئے خدا کو ایک ماموّر بھیجنے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی، اس کی تکمیل کی۔ معلوم نہیں یہ حضرات انہیں (محمد علی صاحب) کو بھی ماموّر مانتے ہیں یا نہیں!

یہ ہے اس جماعت کے عقائد کی حیثیت!

کھاتہ دار متوجہ ہوں

پروفیسر صاحب کی ایک مدت سے نایاب کتاب ــ اقبالؒ اور قرآن ــ کا جدید ایڈیشن چھپ کر آگیا ہے۔ حسبِ معمول یہ کتاب کھاتہ داروں کو بصیغۂ رجسٹرڈ بک پوسٹ بھیجی جا رہی ہے۔ اگر کسی کھاتہ دار کو کتاب درکار نہ ہو تو وہ ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء تک ہمیں اس امر سے مطلع کر دیں۔

(ناظم ادارہ)

اقبالؒ کے خلاف سازش!

کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سازش درحقیقت خود پاکستان کے خلاف ہے۔ اگر پاکستان سے اقبالؒ کی فکر اور پیغام کو نکال دیا جائے تو اس میں اور کسی سیکولر اسٹیٹ (مثلاً روس یا بھارت) میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

۲۔ اقبالؒ کی فکر کا سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ اس لئے اقبالؒ کی فکر کو مسخ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی نظامِ حیات کا صحیح تصور نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

۳۔ اندریں حالات اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ فکرِ اقبالؒ کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں عام کیا جائے۔

۴۔ اس مقصد کو مفکرِ قرآن پرویز صاحب بطریقِ احسن پورا کر سکتے ہیں کہ انھوں نے اقبالؒ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔

۵۔ کوئی بیس سال اُدھر ادارہ طلوعِ اسلام نے علامہ اقبالؒ سے متعلق پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا مجموعہ:-

اقبالؒ اور قرآنؐ

کے نام سے شائع کیا تھا۔ وہ مجموعہ بھی مدت سے نایاب تھا اور اس دوران میں پرویز صاحب نے علامہ اقبالؒ سے متعلق مزید بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ چنانچہ اب اس کا نیا ایڈیشن (۱۹۳۸ء سے ۱۹۷۴ء تک) مکمل کر کے نہایت حسن و خوبی سے شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت (بڑی تقطیع کے) قریب تین سو صفحات۔ کاغذ عمدہ سفید۔ جلد پائدار۔ گرد پوش دیدہ زیب۔
قیمت پچیس ۲۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

بتقریبِ جشنِ یومِ آزادی

زبان کا مسئلہ

(مطبوعہ: طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء)

ہم ملتِ پاکستانیہ کو یاد دلاتے رہتے ہیں کہ:-

۱- تحریکِ پاکستان کا مقصد و منتہیٰ کیا تھا! اس میں کشمکش کیا تھی اور کس کس کے درمیان تھی!

۲- یہ یاد دہانی اس لیے ضروری ہے کہ اس تحریک اور مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں جن سے مقصد یہ ہے کہ اس تحریک و مطالبہ کا حقیقی مفہوم ہماری نئی نسل کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

۳- اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے آج تک نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی صحیح اور مستند تاریخ مرتب کی ہے اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ کی کوئی قابلِ اعتماد سوانح حیات۔ سردست، یہ تاریخ اس دور کے طلوعِ اسلام کی فائلوں میں محفوظ ہے۔ وہیں سے آپ اس حقیقت کو بھی سمجھ لیں گے کہ پاکستان میں جو کچھ تحریکِ پاکستان یا قائدِ اعظم و اقبالؒ کے (ابلہ فریب) نام سے کیا جا رہا ہے، کس طرح کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں "طلوعِ اسلام" یا اس کے بانی پرویز صاحب کا نام نہ آنے پائے۔ یہ اس لیے کہ یہ حضرات چاہتے ہی نہیں کہ اُس دور کی صحیح تاریخ سامنے آ جائے۔ آنے والا مؤرخ اس حقیقت سے پردہ اٹھائے گا کہ جو کچھ طلوعِ اسلام نے کیا تھا اس کا تذکرہ کیے بغیر تحریکِ پاکستان کی تاریخ ناتمام رہ جاتی ہے۔

۴- ملحص اس کشمکش کا یہ تھا کہ ہندو کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص باقی نہ رہے۔ ..... اس نے جو مختلف حربے استعمال کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اُردو زبان کو ختم کر دیا جائے۔

طلوعِ اسلام نے ہندو کی اس مذموم کوشش کے خلاف کس طرح جہاد کیا۔ اس کی ایک مثال وہ بسیط مقالہ ہے جو اس کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ واضح رہے کہ ۱۹۳۸ء میں مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کے تصور نے ابھی متعین مطالبہ کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ بایں ہمہ آپ دیکھیں گے کہ طلوعِ اسلام اس زمانے میں بھی کس قسم کے نظریات کی نشر و اشاعت کے لیے وقف تھا۔

آپ اس مقالہ کو محض نظری یا علمی بحث نہ سمجھئے۔ زبان کے مسئلہ کا قوموں کے وجود اور مستقبل کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

۵- اور اسی نہج سے ہم آخر میں بتائیں گے کہ پاکستان دشمن قوتیں آج بھی اس باب میں خود پاکستان میں کس طرح

معروضات بہ عجلت ہیں۔

اب آپ وہ مقالہ ملاحظہ فرمائیے جس کا عنوان تھا۔

زبان کا مسئلہ

"وردھا اسکیم" والے مضمون میں ہم بصراحت لکھ چکے ہیں کہ اس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں ہندوؤں کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جوں جوں ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں آتی جائے وہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے ہندوستان میں مسلمان من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں۔ مسلمانوں کا الگ قومی تشخص انہیں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں اور جنہوں نے یہاں بود و باش اختیار کی ان میں سے صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جسے یہ "اکال الامم" اپنے اندر جذب نہیں کر سکا۔ ورنہ ان کے سوا سب کے سب رفتہ رفتہ یہاں پہنچ کر ہندو ہو گئے۔ مسلمانوں کی انفرادیت مٹانے کے لئے ہندو پوری قوت سے سرگرم عمل ہے اور اس کے لئے اس نے طریق کار وہ اختیار کیا ہے جسے ہم نے دریا کی پُرسکون روانیوں سے تشبیہ دی تھی۔ میدان سیاست میں ایک "متحدہ قومیت" کی تشکیل کا حسین تصور پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج و عواقب کو (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) "پنچایتی حکومت کے خاکہ" کے دلفریب نقاب میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اختلاف مذاہب چونکہ "ہندو مسلم اتحاد" کے راستہ میں روڑا اٹکاتا ہے۔ اس لئے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا معصوم سبق دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام تمام ادیانِ عالم پر فوقیت رکھتا ہے۔ چونکہ بچوں کے قلب و دماغ کو "تنگ نظری اور تعصب" کے زہر سے مسموم کر دیتا ہے اس لئے درس گاہوں میں ایک ایسے مذہب کی تعلیم کی تجویز کی جا رہی ہے جو اکبر کے دینِ الٰہی یعنی دورِ حاضرہ کے برہمو سماج کے خطوط پر مشتمل ہے۔ ہنسا کے مسلک سے چونکہ سبعیت و بہیمیت کے خونخوار جذبات کی انگیخت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی جگہ اہنسا کا فلسفۂ حیات جنت قلب و نظر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اور تعلیم کے ان تمام غیر اسلامی عناصر کو "روحانی" کے دلکش غلاف میں لپیٹ کر ایسا خوش آئند "سنبوسہ" بنا دیا گیا ہے کہ جو دیکھے لپک کر اٹھا لے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے اُردو کی جگہ ہندی زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور اصل مقصد کو آنکھوں سے اوجھل رکھنے کے لیے کہا یہ جاتا ہے کہ متحدہ قومیت کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

مسئلہ کی اہمیت

مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انہیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے۔ کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں، زبان کا غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ اس وقت وہ قوم اپنی زبان

چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے۔ اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے۔ اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔

یہ ایک "تنگ نظر" مسلمان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ "کشادہ ظرف" ہندو بھی اس کے مؤید ہیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:۔

> ایک قوم کے لئے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں ...... کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکتی ہو جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں۔

ایک اور جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

> "رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے۔ (میری کہانی جلد اول ص۲۹۵)

ان الفاظ کو ذرا غور سے پڑھئے اور انہیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجئے۔ کیونکہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی۔

"استادانِ ازلی"

ہم "واردھا اسکیم" والے مضمون میں بتا چکے ہیں کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن بلکہ مذہب کو مٹانے کے لئے ہندو کس طرح انگریز کے قدم بقدم چل رہا ہے۔ اس لئے کہ بساطِ سیاست کی تمام چالیں ہندو نے انگریز ہی سے سیکھی ہیں۔ انگریزوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دے کر جو کاری ضرب ...... (MASTER STROKE) لگائی تھی۔ اس کا نتیجہ آپ اپنے ماحول میں دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے علاقائی زبان (ورنیکلر) کو یکسر نہیں مٹایا۔ اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اسے زندہ رہنے کا حق اسی طرح دیا جس طرح

"مذہبی آزادی" کا حق عنایت کیا ہے۔ اسی طرح کراچی کے ریزولیوشن میں "بنیادی حقوق" کے سلسلہ میں کانگریس کی طرف سے یہ حق دیا گیا ہے۔ انگریزوں نے صرف اتنا ہی کیا کہ ذریعہ تعلیم کو بدل دیا، اور جدید زبان جاننے والوں کے لئے ترقی کے دروازے کھول دیئے۔ سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی مدت نہیں، مگر آپ نے دیکھا کہ اس سو سال کے اندر اس پالیسی نے کیا نتائج پیدا کر دیئے۔ ہم انگریزی پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات نے اپنی زبان سے اور اس کے ساتھ ہی اپنے ماضی سے، اپنی قومی روایات سے، اپنے لٹریچر سے، اپنی تہذیب و تمدن سے، اور اپنے خیالات سے بیگانہ ہو گئے۔ انگریزی زبان اور انگریزی قوم کے خیالات ہمارے دل و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں گھس گئے اور اس پالیسی نے ہمیں اندر سے بدل دیا۔ (جسے قرآن کریم "تغیر النفس" کہتا ہے کہ جس کے بدلنے سے ساری قوم بدل جاتی ہے۔) گویا وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے پیش نظر میکالے اور اس کے رفقاء کار نے یہ تجویز کی تھی۔ یعنی "اس زبان کے ذریعے سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر روح کے اعتبار سے انگریز ہو گی۔" ذرا اپنے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ کی ساخت کو ملاحظہ فرمائیے وہ کس قدر مغربی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ انگریزوں نے مذہبی آزادی کو برقرار رکھا۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن میں مداخلت نہیں کی۔ لیکن ایک زبان کے بدل دینے سے قوم کی قوم کو ان کے مذہب اور تمدن سے اس قدر بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر بنا دیا کہ عیسائی مشنریز (پادری) ہزار برس بھی "مسیح کی منادی" کرتے رہتے تو یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ ہماری حالت آج یہ ہے کہ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی نگاہ سے ہیں، کان اپنے ہیں لیکن سننے کسی اور کی قوت سماعت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے ذریعہ ادراک سے ہیں۔ ہم بالکل "ہز ماسٹرز وائس" بن گئے ہیں۔ ایک انگریز، مسلمان ہو کر بھی "انگریز" ہی رہتا ہے۔ لیکن ایک تعلیم یافتہ مسلمان، مسلمان کہلاتے ہوئے بھی "مسلمان" نہیں ہوتا۔ یہ قلب و نظر کی تبدیلی کس چیز نے پیدا کر دی؟ یہ ذہنیت کس نے بدل دی؟ صرف زبان کی تبدیلی نے، اور وہ تبدیلی بھی جبری تبدیلی نہیں۔ آپ کی زبان کو مٹا کر نہیں، ہنسی خوشی، آپ کی پوری آزادی برقرار رکھتے ہوئے مدرسوں میں عربی، فارسی، اردو کی تعلیم کی باقاعدہ اجازت دیتے ہوئے، تعلیم کا اختیاری رکھتے ہوئے۔ (یعنی جس کا جی چاہے بچے کو پڑھائے نہ جی چاہے نہ پڑھائے) آپ کے رسم الخط کو برقرار رکھتے ہوئے! سمجھے آپ کہ زبان کا مسئلہ کس قدر اہم ہے۔ فَاعْتَبِرُوا يَا اُولِي الْاَبْصَار۔

"شاگردان رشید"

ہندوستانی قومیت کے معمار بھی انہی کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے اپنی قومیت کو بنانے اور دوسروں کی قومیت کو بگاڑنے کی تدابیر بھی انہی سے سیکھی ہیں۔ انگریز چونکہ غیر ملکی تھا اس لیے اس کے نظر فریب مصالح مشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن یہ چونکہ اسی ملک کے لوگ ہیں اس لیے ان کے لئے وہ انقلاب پیدا کر دینا آسان ہے جس کی جرأت ان کے استاد نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ ان کے پاس "وطن کی مشترکہ فلاح و بہبود" کا دعویٰ ایک ایسا کارگر حربہ ہے جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو مکمل فریب دے سکتے ہیں (اور دے رہے ہیں) اور کوئی ان کو ٹوکنے

کی جرأت نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ اس میں ٹوڈی، رجعت پسند، سامراج پرست کے گھناؤنے القاب سننے کی ہمت نہ ہو۔ انگریز یہاں "متحدہ قومیت" کا تصور پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے ان کی اقلیت یہاں کی اکثریت میں گم ہو جاتی۔ لہٰذا انہوں نے حاکم و محکوم کے فرق کو محفوظ رکھا لیکن اس کا تلخ نتیجہ آج ان کے سامنے ہے۔ ہندو اس تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی اکثریت کو الگ حاکم قوم کی شکل میں متمیز کر کے اقلیتوں کے دل میں محکومیت کے نفرت انگیز احساس کو زندہ رکھے جو بالآخر حاکم قوم کے خلاف انقلابی رنگ اختیار کر لیتا ہے وہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیے یہ بات زیادہ مصلحت آمیز سمجھتا ہے کہ ایک متحدہ قومیت کے جاذبِ نظر تصور کو پیش کر کے اقلیتوں کو اکثریت کی زنبیل میں لپیٹ لے اور ان کا رنگ و بو قائم نہ رہنے دے — اقلیتیں یہ سمجھ کر خوشی خوشی اکثریت کے اندر جذب ہو جائیں کہ ہم جمہوری حکومت کی مشینری کا ایک جزو لاینفک بن رہی ہیں گو کہ حقیقت یہ ہو کہ وہ مشینری ان کو اس انداز سے پیس کر رکھ دے کہ آئندہ ان کی طرف سے کوئی خطرہ ہی باقی نہ رہے۔ یعنی یہ اپنا الگ قومی تشخص کھو کر اکثریت کے اندر ہی جذب ہو جائیں۔ تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ مخلوط انتخاب، مخلوط پرچم، مخلوط نام، مخلوط تعلیم۔ اور اس کے بعد مخلوط زبان اسی مخلوط قومیت کی طرف لے جانے والے راستے ہیں جن سے مقصد و حید یہ ہے کہ مسلمانوں کی اہم اقلیت جو ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کی حالت میں اکثریت کی حکومت کے لیے خارِ چشم کا حکم رکھتی ہے، اکثریت کے اندر جذب ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کی زبان کا مٹانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کے لئے آج ہندو پوری سرگرمی سے مصروفِ جد و جہد ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم "وارد ھا اسکیم" والے مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ آزادیٔ ہند کے سب سے بڑے علمبردار مہاتما گاندھی نے "سیاست" سے الگ ہو کر خالص "اصلاحی" تحریکوں کو اپنا نصب العین زندگی بنا رکھا ہے۔ ان میں اچھوتوں کی اصلاح اور ہندی کی ترویج اہم تحریکیں ہیں۔ "خدا نکردہ" ان کا مقصد یہ نہیں کہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو مٹا ڈالیں۔ ان کا مقصد تو صرف اس قدر (اور کس قدر "پاک مقصد" ہے) کہ ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی "قومی زبان" بنا دیں۔ اگر اس کا نتیجہ عملاً وہی نکلتا ہو جو اردو زبان کے مٹانے کا ہو سکتا ہے یا اس سے اردو زبان خود بخود مٹ جائے تو اس میں مہاتما جی کا کیا قصور، اس لئے کہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے انچارج ڈاکٹر اشرف صاحب ہمیں ایک سرکاری کمیونک میں یقین دلا رہے ہیں کہ گاندھی جی کو ایسا کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اور ان کا یہ فعل "فرقہ پرستی" نہیں۔ ہاں اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا ضرور "فرقہ پرستی" ہے۔

گاندھی جی کا خیال یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیئے۔ ("ہریجن" بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۷ء) مگر یہ بات وہ ہندو "فرقہ پرست" ہونے کی حیثیت سے نہیں کہتے بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور دوسری قوموں کو ملا کر جو قوم بنانا پیشِ نظر ہے اس کی زبان ہندی ہو اور رسم الخط ہندوستانی۔ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے وہ طریق کار اختیار کیا ہے جو ایک مخلوط قوم پرست" کو اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ جب کانگریس میں تشریف لاتے ہیں تو ہندوستان کی مشترک "قومی زبان" کا نام "ہندوستانی" رکھتے ہیں مگر جب ہندی سمیلن میں تشریف لے جاتے ہیں تو اسی قومی زبان کا نام "ہندی" ہو جاتا ہے۔

مدراس میں ہندی سمیلن کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"صرف ہندی زبان میں جس کا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اردو بھی پڑ گیا، اور جو دیوناگری اور اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس کی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے۔ (ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معاشی کا کمیونک)

اسی رجحان کے تحت "ہندی ہندوستانی" کی اصطلاح وضع کی گئی اور پھر اس کا نام "ہندی اتھوا ہندوستانی" (ہندی یعنی ہندوستانی) ہو گیا۔

ایک دوسرے موقع پر بھارتیہ ساھتیہ پریشد (وفاق ادبیات ہند) کے اجلاس منعقدہ مدراس میں گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اس کے حسب ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معاشی کے سرکاری بیان سے نقل کئے جاتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ "فرقہ پرستی" کے برخلاف "قوم پرستی" کس طرح کام کرتی ہے:۔

"میں نے آج نہیں بلکہ ۱۹۳۵ء میں ہندی ... ساھتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اس کی تعریف میں اردو آجائے۔ جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے "ہندی" اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اردو، اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔" اس کے بعد بھارتیہ ساھتیہ پریشد کا زمانہ لیجئے جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اس کے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی ہندوستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پُرزور مخالفت کی، مگر میں ان کی تجویز نہ ماننے کے لئے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں ہندی کے لفظ کو نکال دیتا، تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا۔ اس لئے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اردو کو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھئے کہ "ہندی" لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے۔ یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد و مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو "ہندی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ پھر اب، جبکہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ اور غوغا کیوں ہے؟ اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہاں تک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے وہ صرف ایسی ہندی

> سے لاگ کہا سکتی ہیں۔ جن میں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لئے کہ یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں۔"

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی "قومی زبان" کے ارتقاء کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو قومیت ہند کے اس "معمارِ اعظم" کے پیشِ نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق پہلا مرحلہ یہ ہے کہ "ہندی" کے دامن کو پھیلا کر "اُردو" کو اس میں سمیٹ لیا جائے۔ اُردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سے تبدیلِ نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام "ہندی" سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیّل زندہ نہ رہ سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر اُردو کو آہستہ آہستہ ہندی کے قریب لایا جائے۔ اس میں ہندی اسالیبِ بیان، سنسکرت الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کی جائیں اور اس طرح "ہندی" کا دامن اُردو کو ساتھ لئے ہوئے سکڑنا شروع ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے اسالیبِ بیان اور اپنے ذخیرۂ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے۔ بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب اُردو اسطرح ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سرِدست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریزولیوشن کے کھلونے سے اُردو والے دل کو بہلاتے رہیں، جب "قوم پرستی" بڑھے گی اور اس کے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہوگا، تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائے گا۔ ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ پہلے عبداللہ کا نام پرمیشری داس رکھ دیا جائے۔ جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغا کیوں برپا کرتے ہو؟ پرمیشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبداللہ کے ہیں۔ صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں، معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پرمیشری داس ذرا کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو، اپنا یہی لباس جو تم کھاتے ہو پتیل پر رکھ کر کھانے لگو۔ اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں اور فائدہ یہ ہے کہ یہ کروڑوں کی آبادی جس کے ساتھ تمہارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے اس سے تمہاری اجنبیت دور ہو جائے گی۔ جب پرمیشری داس صاحب اس معقول تجویز کو بھی مان لیں تو انہیں زیادہ نہ چھیڑو۔ آہستہ آہستہ انہیں اسی راستہ پر بڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو ان کے صاحبزادے دھرم چند (جو شاید پہلے قمرالدین ہوتے) یا ان کے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے) خود بخود شدھ پیدا ہوں گے بغیر اس کے کہ ان کی شدھی کے لیے شنکر اچاریہ آف شاردا پیٹھ کی مدد حاصل کی جائے۔ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

ہندی زبان

مہاتما گاندھی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اس واقعہ سے بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ قدیم زمانہ میں خود مسلمان بھی اُردو کو ہندی کے نام سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ اس لئے اگر اب ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام "ہندی" رکھ دیا جائے تو یہ گویا اصل کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ یہ دلیل بظاہر کس قدر خوش آئند اور محکم اور کتنی انصاف

پر مبنی ہے۔ لیکن جن حضرات کی نگاہ تاریخ کے اوراق پر ہے، انہیں یہ معلوم کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی کہ مہاتما جی نے حقیقت کو کتنے باریک "ململی پردہ" میں چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مسلمان قواعدِ زبان کی رُو سے ہند کی ہر چیز کو یائے نسبتی کے ساتھ ہندی کہتے تھے۔ (جیسے عرب سے عربی، فارس سے فارسی۔ اسی طرح ہند سے ہندی) اس وقت یہاں کی مروجہ زبان کے مقابلہ میں کوئی اور زبان ایسی تھی ہی نہیں، جسے اصطلاحاً الگ نام رکھانے کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ زبان جسے آج کل کی اصطلاح میں "ہندی" کہتے ہیں، بعد کی پیداوار ہے، اور خالص ہندوانہ ذہنیت کی پیداوار۔ ارباب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اٹھارویں صدی کے اخیر تک اُردو کے مقابلہ میں کسی اصطلاحی "ہندی" زبان کا چرچا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں للو جی نے پریم ساگر نامی کتاب لکھی۔ یہ ناگری رسم الخط میں تھی اور اس میں اُردو اس قسم کی استعمال کی گئی تھی، جس سے فارسی کے عناصر فی الجملہ خارج کر دیئے گئے تھے، اور ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے تھے۔ یہ تھی ہندی کی کتاب۔ یعنی اُردو کے مقابلہ میں ایک نئی زبان جسے اصطلاح میں ہندی کہا گیا۔ چونکہ اس زبان کا رسم الخط فارسی رسم الخط (یعنی مسلمانوں کے رسم الخط) سے مختلف تھا اور سنسکرت کے رسم الخط (یعنی ہندوؤں کی قدیم زبان کے رسم الخط) کے مطابق۔ نیز اس میں عربی فارسی الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ کے استعمال کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اس لئے ہندوؤں نے اسے اپنی زبان قرار دے لیا اور اس کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لینے لگے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ بات کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی، اس لئے انہوں نے اس تحریک کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن ہندو تو بساطِ سیاست کے بڑے گہرے شاطر واقع ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ ۱۸۶۹ء میں اس نے ایک خاص منظم صورت اختیار کر لی۔ جب ۲ دسمبر کو بابو سردو پرشاد نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ الہ آباد انسٹی ٹیوٹ کی روئداد اُردو کے بجائے ہندی میں لکھی جائے۔ اس وقت کچھ اربابِ بصیرت مسلمانوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا۔ اور سرسید، سید وارث علی، خان بہادر میر سید محمد، فدا حسین اور منصور احمد وغیرہ حضرات نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، جلوۂ طور میرٹھ، اور اودھ اخبار لکھنؤ، میں اس کے خلاف مضامین لکھے۔ مسلمانوں کا چونکہ دورِ انحطاط تھا اس لئے ان کی مساعی قلم و قرطاس کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بلکہ اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ لیکن ہندو اپنی دوسری تحریکوں کی طرح اس تحریک کو بھی منظم طریق پر آگے بڑھاتے رہے، اور پوری استقامت کے ساتھ اسے جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اب وہ اسے ایک قومی تحریک کا خوشنما لباس پہنا کر میدانِ عمل میں لے آئے ہیں۔ ہندو، ان تمام تحریکوں کو کم و بیش نصف صدی سے آتشِ خاموش کی طرح اندر ہی اندر سلگاتے چلے آ رہے ہیں، اور مسلمانوں کو اُس وقت ہوش آیا ہے۔ جب وہ پوری حدت اور تمازت کے ساتھ شعلہ بار ہو چکی ہیں، پھر چونکہ ہندو، ان تمام تحریکوں کو منظم طریق پر چلا رہے ہیں، نہ کہ ہنگامی انداز سے اس لئے انہوں نے ایک "مشترکہ مقصد" یعنی حصول آزادی کے لئے متحدہ قومیت کی تشکیل کی کوشش کے ماتحت کچھ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور اس طرح ان خالص ہندوانہ تحریکوں کو "قومی" تحریکوں کا لیبل لگا کر میدانِ سیاست میں لئے آ رہے ہیں۔ ۷۲-۱۸۶۹ء میں چونکہ ایک طرف سرسید اور منصور احمد وغیرہ مسلمان تھے، اور دوسری طرف بابو شو پرشاد اور نوبن چندر رائے وغیرہ ہندو، اس لئے ہندوؤں کی تحریک ترویج ہندی

خالص ہندوانہ تحریک تھی۔ لیکن آج چونکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ڈاکٹر اشرف اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہیں، اس لئے آج وہی تحریک قومی تحریک بن گئی ہے۔ اور اس کی مخالفت کرنے والے خود مسلم قومیت پرست حضرات کے نزدیک، انتہائی نفرت انگیز القابات کے مستحق ہیں۔ یہ ہیں بساطِ سیاست کی گہرکاریاں!!

ہندو ذہنیت کا مظاہرہ

جب یہ تحریک اس زور اور قوت کے ساتھ پھیلائی جانے لگی تو مسلمانوں کی اس جماعت نے جس کی نگاہیں "متحدہ قومیت" اور "مشترکہ زبان" کے فریب کو بے نقاب دیکھ چکی تھیں، اس کے خلاف آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہا کہ یہ محض ایک ادبی اور مجلسی مسئلہ نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ان کی ملی اور جماعتی موت و حیات کا رشتہ بندھا ہوا ہے۔ تو کانگریس کا ہندوانہ سیلاب بلا چاروں طرف سے امڈ آیا۔ مضمون کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے خود تسلیم کیا ہے کہ ایک قوم کی تہذیب و تمدن کو مٹانے یا برقرار رکھنے کے لئے زبان کا مسئلہ کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جب اس اہمیت کا احساس کرتے ہوئے مسلمانوں نے ہندوؤں کے اس طرزِ عمل کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی زبان کے تحفظ کا مطالبہ کیا تو انہی پنڈت جی نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ "فارسی اور دیوناگری کے جھگڑے احمقانہ ہیں۔" (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۱۶۵) اللہ اکبر! وہی رسم الخط جس کے بدل جانے سے خود پنڈت جی کے الفاظ میں یہ اندیشہ ہے کہ "الفاظ کی شکلیں بدل جائیں گی۔ آوازیں بدل جائیں گی۔ خیالات بدل جائیں گے۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جائے گی، اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جائے گا، جو مردہ ہو چکی ہے۔" جب اس کے تحفظ کے لئے مسلمان آواز بلند کریں تو یہ جھگڑا احمقانہ بن جاتا ہے! یہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ خود پنڈت جی بیان فرماتے ہیں کہ "ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ایک متحدہ قوم پیدا ہو۔" (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۷ء) اس لئے اگر مسلمان اپنی زبان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنا چاہیں تو وہ "فرقہ پرست" ہیں۔

> "مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور ہے، اور اس بنا پر زبان میں علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ برابر اپنا اثر دکھائے جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشوونما کے ساتھ یہ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائے گی۔ .... ایک علیحدگی پسند، حامیٔ زبان کو اوپر سے کھرچو، تم دیکھو گے کہ اندر سے وہ فرقہ پرست ہے۔ بلکہ زیادہ تر تم اسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے۔" (یہ پنڈت جی کا مضمون ہے جو ہندوستان کے اکثر اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔)

ان تصریحات سے آپ پنڈت جی کا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کو ایک قابلِ نفرت "فرقہ وارانہ مسئلہ" قرار دینا اور "سیاسی رجعت پسندی" سے موسوم کر کے اسے اور زیادہ ذلیل بنانے کی کوشش کرنا کچھ اس وجہ سے نہیں کہ پنڈت جی زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ نہیں! بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے وہ اس کی اہمیت سے خوب واقف ہیں، اور اسی واقفیت کی بنا پر وہ اس کے خلاف اپنی مخصوص سیاسی زبان کے

شدید ترین الفاظ ——— "فرقہ پرستی"، "رجعت پسندی"، "سامراج پرستی" وغیرہ ——— پورے زور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تاکہ اس گولہ باری سے یہ قلعہ کسی طرح منہدم ہو جائے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی ایک مخصوص قومی زبان کا محفوظ رہنا دراصل ان کی مخصوص قومیت کے محفوظ رہنے کا ہم معنی ہے۔ جب تک یہ زبان ایک علیحدہ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اور اس میں وہ الفاظ اور اسالیبِ بیان موجود ہیں، جو اسلامی ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس وقت تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کی مستقل قومی تہذیب فنا نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ اس لٹریچر سے بے گانہ ہو سکتے ہیں، جو ان کے ذہن میں اس قومیت اور اس تہذیب کی قدر و قیمت پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری نہیں بلکہ ..... کامل باخبری ہی ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ زبان میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو "فرقہ پرستی" جیسے گھناؤنے القاب سے یاد کر کے آزادی پسند مسلمانوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کریں، اس لئے کہ دراصل ان کا نصب العین ہندوستان کی تمام آبادی کو "ایک قوم" بنانا، اور جداجدا قومیتوں کو فنا کر دینا ہے۔ ان کے نزدیک "سیاسی رجعت پسندی" یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی قوم اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور "سیاسی ترقی پسندی" یہ ہے کہ سب قوموں کے لوگ اپنی اپنی قومیتوں کو چھوڑ کر اس "ایک قوم" میں جذب ہو جائیں جسے پنڈت جی وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کے لئے منجملہ دوسری تدابیر کے ایک یہ تدبیر بھی ضروری ہے کہ ایک "مشترک قومی زبان" پیدا کی جائے اور ہر ایسی زبان کو مٹا دیئے یا کم از کم مسخ کر دینے کی کوشش کی جائے، جو کسی قوم کی جداگانہ قومیت کو سہارا دیتی ہو۔

یہی نصب العین ہے جسے پیشِ نظر رکھ کر "ہندوستانی" زبان کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ آخری منزلِ مقصود پنڈت جی کے نزدیک بھی یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط دونوں میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو مٹا دیا جائے۔ لیکن وہ اپنے ہم مشربوں سے زیادہ ہوشیار ہیں، اس لئے کہتے ہیں کہ تدریج کے ساتھ ایک ایک قدم بڑھاؤ، دفعتاً رسم الخط پر ہاتھ ڈالو گے تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لہٰذا سردست اس کی حفاظت کا اطمینان دلاؤ، اور پہلے الفاظ و اسالیبِ بیان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان دور کرنے کی کوشش کرو، جب اردو زبان عربی و فارسی الفاظ کے ذخیروں سے خالی ہو کر ہندی الفاظ سے بھرپور ہو جائے۔ جب ذخیرۂ الفاظ کے بدلنے سے اسالیبِ بیان اور خود حقیقتِ بیان میں تغیر پیدا ہو جائے، تو سمجھ لو کہ آدھا معرکہ سر ہو گیا۔ اس کے بعد دیکھیں گے ——— مستقبل نے اگر کوئی مناسب موقع فراہم کر دیا تو رسم الخط میں بھی "علیحدگی پسندی" کا رجحان مٹا دیا جائے گا اور "مشترک قومی زبان" کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دانشمندانہ پالیسی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر پنڈت جی فرماتے ہیں:-

"اس لئے دانشمندی کے ساتھ ہم نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں (رسم الخطوں) کو پوری آزادی حاصل رہے۔ اگرچہ یہ اُن لوگوں پر ایک مزید بار ہوگا۔ جنہیں دونوں کو سیکھنا پڑے گا، اور یہ ایک حد تک علیحدگی پسندی کے لئے بھی مددگار ہوگا۔ مگر ہمیں انہیں نقصانات کے ساتھ کام کرنا پڑے گا، کیونکہ ہمارے لئے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے..... مستقبل ہمارے لئے کیا کچھ لائے گا، اس کی مجھے خبر نہیں، مگر سردست دونوں کو باقی رہنا

چاہیئے۔" (پنڈت جی کا مذکورہ بالا مضمون)

اس کے بعد پنڈت جی فرماتے ہیں:-

میں اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رکھتا کہ ہندی اور اردو دونوں ایک دوسرے کے قریب آکر رہیں گی، خواہ یہ دونوں مختلف لباس پہنے رہیں، مگر اپنے جوہر اور روح کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہوں گی۔ جو قوتیں اس وحدت کی تائید کر رہی ہیں وہ اس قدر طاقتور ہیں کہ افراد اُن کی مزاحمت نہیں کر سکتے، یہاں قوم پرستی ہے اور ایک متحد ہندوستان دیکھنے کی خواہش عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی کی فتح ہو کر رہے گی ..... اگرچہ ہم خوشی کے ساتھ اس علیحدگی کو برداشت کریں گے، جو اس وقت قائم ہے۔ مگر ہمیں وحدت قائم کرنے والوں کو اس عمل میں مدد دینی چاہیئے۔ (مضمون مذکور)

یہاں آکر پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کے راستے مل جاتے ہیں۔ اگرچہ پنڈت جی علیحدگی کے رجحان کو سخت قابلِ نفرت سمجھتے ہیں اور مہاتما جی کے طرزِ عمل میں علیحدگی پسندگی کا یہ رجحان بالکل نمایاں ہے۔ اس بنا پر پنڈت جی کو مہاتما جی سے نہ صرف اختلاف کرنا چاہیئے تھا، بلکہ انہیں "فرقہ پرست" اور "سیاسی رجعت پسند" کہنا چاہیئے تھا۔ مگر چونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے اور دونوں ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف مگر علیحدہ راستوں سے چل کر ایک مقام پر مل جاتے ہیں اس لئے دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو کھرچنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بلکہ پنڈت جی مہاتما جی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"کم سمجھ لوگ خود گاندھی جی کو اُس چیز کا مجرم ٹھیراتے ہیں جس کے خلاف انہوں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے۔" (جامعہ مورخہ اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۳-۹)

کھلی ہوئی "فرقہ پرستی" کے مقابلہ میں "قوم پرستی" زیادہ کامیاب چیز ہے۔ آپ علانیہ پرندوں کے لئے جال پھیلائیں گے تو چند بے وقوف پرندوں کے سوا کوئی اس میں نہ پھنسے گا۔ دام، ہمرنگِ زمین ہونا چاہیئے۔ دانہ بکھرا ہوا ہونا چاہیئے اور ایک ہوشیار شکاری جو پرندوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہو۔ آپ کی مدد پر ہونا چاہیئے، تاکہ وہ ہر طرف سے گھیر گھیر کر پرندوں کو دام کے پاس لائے۔ پھر دیکھئے کہ پرندوں کے ربّ النوع تک جال میں پھنسے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہندوستان کی مشترک فلاح و بہبود کا نام لے کر "قومیت" کا جال بچھایئے۔ اس پر سیاسی ترقی اور معاشی خوشحالی کا دانہ پھیلایئے اور ایک نقیب چھوڑ دیجئے، جو اطراف و اکناف میں اعلان کرتا پھرے کہ جو پرندہ اس جال کی طرف نہ آئے گا وہ فرقہ پرست اور سیاسی رجعت پسند قرار دیا جائے گا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جائے کہ ہمارے سامنے اس وقت سب سے اہم سوال ہندوستان کے افلاس اور بیروزگاری کا ہے اور جو دانہ بکھرا ہوا ہے۔ (نیچے بچھے ہوئے جال کا ذکر نہ کیجئے) اسی سوال کو حل کرنے کے لئے بکھیرا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جھنڈ کے جھنڈ آپ کی طرف آئیں گے اور اسی طرح آپ کے جال پر گریں گے جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔

اثرات

ترویجِ ہندی کی تحریک کو "قومی تحریک" کی شکل اختیار کئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا، لیکن اس کے نتائج و اثرات اس قدر واضح اور یقینی طور پر سامنے آچکے ہیں کہ اگر ہندو نوازی کی پٹی کو آنکھوں سے اتار کر دیکھا جائے تو ممکن ہی نہیں کہ کوئی مسلمان اس خطرے سے انکار کر سکے، جو مستقبل قریب میں اس راستہ سے اُن کی تہذیب و تمدن کو مٹانے کے لئے ایک سرکش و بے باک طوفان کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اُس کی چند مثالیں بیان کریں، یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ کانگریس کا رجو ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی نمائندگی کی مدعی ہے) اس باب میں لفظی دعویٰ کیا ہے، تاکہ اس کے بعد اچھی طرح سے معلوم ہوسکے کہ دعوےٰ کیا ہے اور عمل کیا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مسلمانوں کو جب کبھی ہندوؤں کے کسی طرزِ عمل کے خلاف شکایت پیدا ہوتی ہے تو ہندوؤں کی مدافعت اور حمایت میں حضرت مولانا آزاد ہمیشہ گواہوں کے کٹہرے میں تشریف لے آتے ہیں، اور مسلمانوں کو مورد الزام اور ہندوؤں کو حق بجانب قرار دینے میں پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ زبان کے مسئلہ میں بھی جب مسٹر جناح[1] نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ہندوؤں کی روش کو مفادِ اسلامی کے خلاف ثابت کیا تو حضرت مولانا کی طرف سے ایک طویل بیان اخبارات میں شائع ہوگیا جس کے دوران میں وہ فرماتے ہیں۔

> میں مسٹر جناح کو یقین دلاتا ہوں کہ انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ سنا ہے، وہ بالکل غلط ہے۔ اگر وہ حقیقتِ حال معلوم کرنے کی ذرا سی کوشش بھی کریں گے تو انہیں اپنے الزامات پر افسوس ہوگا، کانگریس کی قرارداد، اور نہ صرف قرارداد، بلکہ اس کا عمل بھی، ذمہ دار مسلمان جماعتوں اور حامیانِ اُردو کے مطالبات کے بالکل مطابق ہے اور فی الحقیقت وہی مسئلے کا ایک ہی صحیح حل ہے۔ یعنی وہ صاف اور سلیس اُردو جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے، قومی اور ملک کی باہمی صحبائی زبان کے طور پر تسلیم کی جائے اور دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط تحریر کتابت کے لئے استعمال کئے جائیں۔ یہ زبان ایک اور یکساں ہے اور دونوں رسم الخط میں لکھی جاسکتی ہے اور ہر شخص جس رسم الخط کو چاہے اختیار کرسکتا ہے حکومت دونوں رسم الخط کے لئے آسانیاں مہیا کرے گی۔ اس نے سادہ اُردو کے لئے "ہندوستانی" کا لفظ تجویز کیا ہے تاکہ دونوں رسم الخط پر حاوی ہو جائے۔

مسٹر جناح کہتے ہیں کہ کانگریس جو قومی جماعت ہونے کی مدعی ہے، اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ میونسپل اور گورنمنٹ اسکولوں میں ہندی کو لازمی قرار دے۔ لیکن "ہندی" سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیا اُن کی مراد اس سے وہ زبان ہے جو صرف دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اگر ان کی مراد یہی ہے تو میں اُن کو بتاؤں گا کہ کسی کانگریسی حکومت نے دیوناگری رسم الخط کو لازمی قرار نہیں

---

[1] قائدِ اعظمؒ کو اس زمانہ میں "مسٹر جناح" کہہ کر ہی پکارا جاتا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

دیا، یہ صرف "ہندوستانی" زبان ہے جو لازمی قرار دی جائے گی۔ رسم الخط اختیاری ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اُردو ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ دیوناگری ہو۔

میں مسٹر جناح کی توجہ واردھا اسکیم کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین کا بورڈ بروئے کار لا رہا ہے۔ اُس نے اساتذہ کی تعلیم میں اس امر کو لازمی قرار دے دیا ہے کہ وہ دونوں رسم الخط کی تعلیم حاصل کریں اور دونوں کی تعلیم دینے کے قابل ہوں تاکہ ہر طالب علم اس رسم الخط میں مدرس سے تعلیم حاصل کر سکے، جس کو وہ پسند کرتا ہے۔ کیا مسٹر جناح کی مراد "ہندی" سے وہ زبان ہے جس میں جان بوجھ کر سنسکرت کے غیر مانوس اور عجیب و غریب الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے جن کو لوگ عام طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر ان کی مراد یہی ہے تو میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں جانتے اور جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ بالکل گمراہ کن ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کانگرس جس زبان کو رواج دے رہی ہے، وہ اُردو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ــــ وہ اُردو جو سادہ و سلیس ہو اور عربی فارسی اور سنسکرت کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ سے مبرا ہو۔ (زمزم ۲۶ جون ۱۹۳۸ء)

اس بیان کی رُو سے حضرت مولانا نے مسلمانوں پر واضح کرنا چاہا ہے کہ کانگرس کی قرارداد اور عمل کی رُو سے:-

۱۔ قومی زبان وہ صاف اور سلیس اُردو ہوگی جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔

۲۔ زبان ایک ہی ہوگی البتہ وہ اُردو اور ناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائے گی۔

۳۔ اس مشترکہ زبان کا نام "ہندوستانی" ہوگا۔

۴۔ اس میں عربی، فارسی۔ سنسکرت کے نامانوس اور غیر معروف الفاظ نہیں ہوں گے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھنے چاہیئے کہ اُردو سے عربی اور فارسی کے "غیر معروف اور نامانوس" الفاظ خارج کر کے پوتر بھارت ماتا کی دیوبانی کو شدھ کرنے والے مولانا آزاد وہی آزاد ہیں جو کبھی الہلال کے مدیر تھے، اور اُردو کے متعلق جن کا اُس وقت خیال یہ تھا کہ:-

اُردو، فارسی کی طرح اپنے علمی ادبیات میں اب تک عربی کے ماتحت ہے۔ اس کا کوئی خاص علمی لٹریچر نہیں۔ اپنی اصطلاحات نہیں۔ جتنی علمی اصطلاحات ہماری زبان پر ہیں، سب کی سب عربی ہیں۔ پس اُردو کے تراجم علوم میں الفاظِ عربیہ کا استعمال ناگزیر ہوا اور اس لئے سند کے لئے اُردو بول چال نہیں، بلکہ عربی لغت اور اصطلاح علوم کا حوالہ مطلوب رہے)...... (ہم) اُردو میں جب کسی علم و فن کو لکھیں گے تو چونکہ اُردو اپنی علمی ادبیات میں عربی کے زیر اثر اور بالکل ماتحت ہے، اس لئے لامحالہ ہمیں عربی اصطلاحات کو مقدم رکھنا پڑے گا۔ (الہلال $\frac{9}{12}$ ۱۷)

ادبی پہلو کے علاوہ اُردو زبان میں عربی الفاظ کے استعمال کے متعلق حضرت مولانا کے نزدیک ایک اہم پہلو اور بھی تھا۔ آپ نے لکھا تھا:-

لوگ معترض ہیں کہ جیں مصطلحات اُردو کے لیے عربی کی مراعات استغراق پر...... کیوں نہ دے

رہا ہوں، یہ کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ حتی الامکان عربی ہی کے الفاظ اُردو کی ادبیاتِ علمیہ میں استعمال کئے جائیں۔ لیکن شاید یہ نکتہ اُن کی نگاہوں سے مخفی ہے کہ صرف عربی ہی نہیں، بلکہ ہر علمی زبان اپنی ماتحت زبانوں کے لئے ایسے ہی حقوق کا مطالبہ رکھتی ہے۔ ...... اصطلاحاتِ مذہبیہ کا سوال جانے دیجئے۔ مسلمان آج تمام اطرافِ عالم میں پھیلے ہیں۔ اُن کی زبان ہر جگہ ایک نہیں ہے۔ لیکن مصطلحاتِ دینیہ اور علمیہ اب تک ایک ہیں، اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے۔ پھر کوئی سبب نہیں کہ تیرہ سو برس کا استحقاق آئندہ کے لئے اس سے سلب کر لیا جائے ...... عربی اُمّ لغتِ اسلامیہ ہے۔ زندہ ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کے لئے کافی اسباب و سامان اپنے پاس رکھتی ہے۔" (الہلال مورخہ ۱۵ 1/14)

کیا ہم حضرت مولانا سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ عربی کا وہ استحقاق جو تیرہ سو سال سے مسلم چلا آتا ہے آج اس کے سلب کرنے کا مجرم کون بن رہا ہے؟ وہ کون ہے جو اُمّ لغتِ اسلامیہ کی آغوش سے اس کے بچوں کو چھین کر انہیں پراچین تہذیب کے اناتھ آلیہ (یتیم خانہ) میں داخل کر رہا ہے؟ وہ کون ہے، جو ہندوستانی مسلمانوں کی زبان سے عربی۔ فارسی کے الفاظ خارج کر کے اطرافِ عالم کے مسلمانوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع کرنے کی فکر کر رہا ہے؟

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی ... یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

کہہ دیا جائے گا کہ اُردو سے محض عربی و فارسی کے "غیر معروف اور نامانوس" الفاظ خارج کئے جائیں۔ تمام الفاظ نہیں، لیکن یہ فرمائیے کہ وہ کونسی کسوٹی ہو گی جس پر یہ پرکھا جائے گا کہ فلاں لفظ "غیر معروف" ہے اور فلاں معروف و مانوس۔ جن کے ہاتھ میں وہ کسوٹی ہو گی ان کی تو آج ہی سے یہ روش شروع ہو گئی ہے کہ وہ الفاظ جو صدیوں سے زیرِ استعمال ہیں اور جن کو بچہ بچہ جانتا ہے انہیں بھی "غیر معروف" قرار دیا جا رہا ہے۔ "صوبہ متحدہ" کو کون نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن وہاں کانگریس حکومت کی وزارت کے ایک زبردست رکن نے یہ تجویز بھی پیش کر دی ہے کہ یہ غیر مانوس لفظ ہے۔ اس کی جگہ "جٹ صوبہ" کا مانوس لفظ استعمال کرنا چاہئے۔ معلوم نہیں "صوبہ" کی جگہ ان کو کوئی "مانوس" لفظ کیوں نہ مل سکا۔ یا مثلاً صوبۂ متوسط میں "مدرسہ" جیسے غیر معروف لفظ کی جگہ "ودیا مندر" کا مانوس لفظ سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح خدمت۔ استقبال۔ انصاف۔ بنیاد۔ عورت۔ مرد۔ جیسے غیر مانوس الفاظ کی جگہ سیوا۔ سواگت۔ نیاؤ۔ نیو۔ استری۔ پرش۔ جیسے مانوس الفاظ بدل کر لائے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ۔ لیکن۔ مگر کی جگہ پرنتو اور کیول نے لے لی ہے۔ "غیر معروف و نامانوس" الفاظ کو اُردو سے خارج کر کے جدید ہندوستانی زبان کی کیا شکل بنائی جا رہی ہے۔ اس کے لئے یوپی کے ایک کانگریس پرست کی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

"اگر مولانا ابوالکلام آزاد جو کانگریس پارلیمنٹری کے ممبر ہیں اور جن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ کانگریسی نقطۂ نظر سے وزارتوں کا احتساب کریں، تکلیف فرما کر ایک بار یہاں کی کونسل میں شریک ہوں، اور ان تقریروں کو سنیں جو ہندو ممبروں اور ہندو وزراء کی طرف سے

ادا ہوتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ضبط نہ کر سکیں گے اور بے اختیار فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہو جائیں گے[1]۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں۔ بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے، اور مسلمان تو مسلمان ہندو پبلک بھی پچاس فی صد ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ پھر یہ بدعت کونسل ہال اور دفتر وزارت تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر عام ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائیاں بھی اب زیادہ تر اسی زبان اور اسی رسم الخط میں قلمبند کی جاتی ہیں اور مسلمانوں کی دلچسپی کو ہر ہر شعبہ سے کم کیا جا رہا ہے۔ یہاں کی ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی سے بعض مسلمان صرف اس لئے استعفیٰ دینے پر مجبور ہوئے[2] کہ دفتر کانگریس سے جو اطلاع اور جو اعلان شائع ہوتا ہے وہ ہندی میں ہوتا ہے۔۔۔۔ درآنحالیکہ لکھنؤ کا ہر ہندو اُردو زبان اور اُردو رسم الخط سے واقف ہے، اور اگر کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ اُردو ہندی دونوں زبانوں میں اعلانات شائع کئے جائیں تو جواب ملتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہیں۔ اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جس وقت سوال کسی اقتصادی یا سیاسی مصلحت کا آئے گا تو سب سے پہلے اس چیز کو محو کیا جائے گا، جو مسلمانوں کی قومی کلچر کی سب سے بڑی امانت دار ہے۔ (نگار، اگست ۱۹۳۸ء)

ان واقعات سے مولانا آزاد کے دعوے کی اس حقیقت کو بھی معلوم کر لیجئے کہ ہندوستانی زبان اُردو اور دیوناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائے گی۔ یہ باتیں تو وہ ہیں جو نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن ان کوششوں سے زبان میں جو تبدیلی غیر محسوس طور پر واقع ہو رہی ہے، اس کا اندازہ غور اور تدبر کا محتاج ہے۔ آپ کسی سینما ہال میں جایئے اور سنیئے کہ وہاں فلم میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ کس دیش کی بھاشا ہے۔ حالانکہ تماشائیوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ یعنی ہندی کا پروپیگنڈا! اس روپے سے ہوتا ہے جس کا بیشتر حصہ خود مسلمانوں کی جیب سے جاتا ہے۔ یا کسی شام ریڈیو کے پاس بیٹھ کر سنیئے کہ غیر محسوس طور پر زبان کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔۔۔ ملازمین کو چھوڑیئے۔ خود براڈکاسٹنگ اسٹیشن (محط نشر الصوت) سے (جو محکمہ ابھی مرکزی حکومت کے ماتحت ہے) جو خبریں نشر کی جاتی ہیں، ان میں بھی سواگت۔ سبھا اور سماج جیسے الفاظ بلا تکلف استعمال ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مطبوعہ پروگرام میں بھی "مجلس" کی جگہ "سبھا" کا لفظ آچکا ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ صوبہ متوسط میں مدرسہ کی جگہ ودیا مندر کا نام سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد سے دریافت کیا گیا کہ صاحب! آپ تو فرماتے تھے کہ اُردو زبان سے عربی، فارسی کے غیر مانوس الفاظ نکالے جائیں۔ یہ مدرسہ کونسا غیر معروف لفظ ہے جس کی جگہ ودیا مندر جیسا مشہور و معروف لفظ تجویز کیا گیا ہے، تو اس پر آپ نے فرمایا کہ

---

[1] اب تو یہ مولانا آزاد کے متعلق حسن ظن ہی ہے۔ ورنہ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ منہ

[2] الحمد للہ کہ ان میں اتنی حمیت باقی تو تھی۔ منہ

مسلمان اُسے بیت العلوم کہہ لیا کریں۔ جھگڑا ختم ہوا۔ سرکاری نام تو ودیا مندر ہی رہے گا۔ لیکن یہی سوال جب مسٹر شکلا سے کیا گیا جو ودیا مندر سکیم کے روح رواں ہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ:۔

"ودیا مندر اپنے اندر کئی کشش رکھتا ہے۔ صوبہ کی نانوے فی صد آبادی کے لئے یہ روحانی وجدان کا ذریعہ اور ان کے جذبۂ خیر کو اُبھارنے کا باعث ہوگا۔" (ودیا مندر اسکیم بحوالہ انقلاب مورخہ ۲۹/۳۴)

آپ نے دیکھا کہ ایک نام کی تبدیلی سے کسی قوم کے بچوں کے جذبۂ روحانی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ تو تھا ہندو بچوں کے جذبات کا احترام۔ لیکن اسی صوبہ میں واردھا کی میونسپل کمیٹی نے اردو سکول کا نام اردو ودیا مندر رکھ دیا تو مسلمانوں نے اس تبدیلیٔ نام کے خلاف احتجاج کیا۔ کونسل میں سوالات ہوئے تو ان کے جواب میں وہی مسٹر شکلا فرماتے ہیں کہ "نام بے شک بدل دیا گیا ہے۔ لیکن نام کے بدل دینے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے کسی فرقہ اور مذہب کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود ہے۔" (مسلم لیگ مورخہ ۲۴/۳۴) یعنی اردو لفظ کی جگہ ہندی لفظ کا استعمال ہندو بچوں کے لئے روحانی وجدان کا ذریعہ اور جذبۂ خیر ابھارنے کا موجب ضرور بن جاتا ہے، لیکن مسلمانوں کے بچوں کو اس سے کوئی روحانی کاوش نہیں ہوتی! یہ ہے مسلمانوں کے جذبات کا احترام! اور اس پر مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کی شکایات ودیا مندر کے نام سے عبث ہیں۔" (انقلاب بابت ۲۹/۳۴) خدا جانے حضرت مولانا کے نزدیک ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی کوئی شکایت بھی معقول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ جب سے وہ مسلمانوں سے الگ ہو کر کانگریس سے جا ملے ہیں، مسلمانوں کی قوم، سب باتیں نامعقول اور بیجا کرنے لگی ہے!

انجمن ترقی اردو (دکن) نے اپنے کچھ مبلغ صوبۂ متوسط میں بھیجے کہ وہ بچشم خویش وہاں کے حالات کا مطالعہ کر کے صحیح صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ ان میں سے ایک مبلغ، سید شیر علی حاتمی نے الہ آباد میں ایک تقریر کے دوران بتایا کہ صوبۂ متوسط میں ابھی سے یہ حالت ہو چکی ہے کہ مانڈھوتا ضلع چھندواڑہ کے اسکول میں ہندو اور مسلمان بچوں کو ہر صبح پرارتھنا کرنی پڑتی ہے۔ سامنے سرسوتی کا بت لا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ سب بچے اس بت کے سامنے گیان اور ودیا پراپت ہونے کی پرارتھنا کرتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان بچے کو آپ سلام کریں تو جواب میں وہ "نمستے" اور "جے رام جی کی" ہی کہے گا۔" (انقلاب۔ مورخہ ۱۰/۳۸)

یہ بھی واضح رہے کہ ودیا مندر کی اسکیم کی رُو سے وہاں بچوں کو ہندی لازمی طور پر سکھائی جاتی ہے۔ (ایضاً) اس واقعہ کو سامنے رکھئے اور مولانا آزاد کے بیان پر پھر ایک نگاہ ڈالیئے جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ کوئی رسم الخط چیری نہیں ہوگا۔

یہ تو تھا ہندی ترویج کا معاملہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُردو کی تخریب کے متعلق بھی وہاں کچھ کمی نہیں کی جا رہی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اُردو (دکن) اپنے ایک بیان میں رقم طراز ہیں:۔

"اب کانگریس حکومت کی نظرِ عنایت ملاحظہ ہو۔ اس نئے عہد میں ضلع بیتول کا واحد اُردو مدرسہ ہندی اسکول میں ضم کر دیا گیا ہے آٹھویں کا اُردو اسکول توڑ دیا گیا ہے، اور کوشش یہ ہے

ورنیکلر مڈل اسکول سے اُردو کو نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔" (انقلاب ۲۲/۷/۴۵)
اور اس پر مولانا آزاد مسلمانوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں کہ تم خواہ مخواہ شور مچاتے ہو۔

پھر مولانا آزاد کا بیان ہے کہ زبان ایک ہی ہوگی۔ البتہ دو رسوم الخط (اُردو اور دیوناگری) میں لکھی جائے گی۔ لیکن عمل اس پر یوں ہو رہا ہے کہ یوپی کی کانگریسی حکومت کے ماتحت کتب قوانین کے جو تراجم "ہندوستانی" میں شائع ہو رہے ہیں اُن میں جو کتابیں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اُن کی زبان اور ہوتی ہے، اور جو اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اُن کی اور (نگار بحوالہ احسان مورخہ ۱۱/۷/۴۵)

پھر حضرت مولانا نے کانگریس کا یہ فیصلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اس مشترکہ زبان کا نام "ہندوستانی" ہوگا لیکن ہم مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ اس بات پر بڑی شدت سے مصر ہیں کہ زبان کا نام "ہندی المعروف ہندوستانی" ہوگا۔ اور جب مولوی عبدالحق صاحب نے اس پر اعتراض کیا تو مہاتما جی کا اصرار اور بھی بڑھ گیا۔ اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس میں سے "ہندی" کا لفظ نکال کر صرف "ہندوستانی" نام رکھنا کبھی گوارا نہیں کروں گا۔ چنانچہ اُن کے نزدیک اس کا نام "ہندی المعروف" (یعنی) "ہندوستانی" ہی ہے۔ یعنی اصل نام تو ہندی ہے۔ البتہ اسی کو عرف عام میں "ہندوستانی" بھی کہہ لیا جاتا ہے۔ مہاتما جی سے کسی نے نہیں کہا کہ لفظ "ہندی" پر اصرار فرقہ پرستی کا آئینہ دار ہے، بلکہ ڈاکٹر اشرف ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ انہیں ایسا کہنے کا پورا حق حاصل ہے۔ البتہ اس کے خلاف کچھ کہنا فرقہ پرستی ہے۔ اگر کہیں مسٹر جناح یہی طرزِ عمل اختیار کر لیں اور کہہ دیں کہ اس زبان کا نام اردو یعنی "ہندوستانی" رکھا جائے تو آپ دیکھیں کہ کس طرح شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ پرستی ہے، رجعت پسندی ہے، ٹوڈیت ہے۔ علیحدگی کا رجحان (SEPARATIST TENDENCY) ہے۔ متحدہ قومیت کی تشکیل کے خلاف ہے اور خدا جانے کیا کیا ہے۔!

پھر مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اُن کے نزدیک "ہندی المعروف ہندوستانی" وہ زبان ہوگی جو جنوبی ہند کی زبانوں سے قریب تر ہوگی اور اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں گے۔ لیکن بایں ہمہ، مولانا آزاد مسلمانوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ یہ جدید زبان صاف اور سلیس ہوگی، جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ نہیں ہوں گے۔ یعنی مہاتما جی زبان کی گاڑی کو مدراس کی طرف لئے جا رہے ہیں اور مولانا صاحب مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ نہیں یہ تمہاری نگاہ کی تنگ نظری کا ثبوت ہے۔ تم یہی سمجھو کہ گاڑی لکھنؤ کی طرف آ رہی ہے اور جو شخص اپنی آنکھوں سے گاڑی کو دیکھ کر کہہ دے کہ نہیں صاحب، یہ تو ہمارے سامنے مدراس کی طرف جا رہی ہے۔ شمال اور جنوب کا فرق کوئی ایسا غیر محسوس فرق نہیں جسے ہم پہچان نہ سکیں، تو کہہ دیا جاتا ہے کہ تمہیں تعصب اور فرقہ پرستی نے اندھا کر دیا ہے۔ گاڑی شمال ہی کی طرف آ رہی ہے۔ خدا کرے کہ کہیں ان حضرات کو بھی وہی آنکھیں مل جائیں جن سے جمہور مسلمان دیکھتے ہیں۔ پھر ان سے پوچھیں کہ گاڑی کدھر جا رہی ہے: ؎

زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں　　کیا جانیئے کیا کہتا۔ کیا دیکھتا۔ کیا کرتا!

مسلمانوں کا طرزِ عمل

ہندوؤں کے متعلق تو آپ نے دیکھ لیا کہ وہ اُردو زبان کو ہندی بنا دینے میں کس برق رفتاری کے ساتھ بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کہ مسلمان اس باب میں کیا کہہ رہے ہیں۔ (اور یہ بھی کیوں! انہوں نے مسلمانوں کی دوستی کا دم کس دن بھرا تھا جو ان سے اس قسم کی توقع کی جائے۔) لیکن اس کے مقابلہ میں اُردو کو سُدھ کر دینے میں خود مسلمانوں کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہندوؤں کے مقصد کو قریب لانے میں اور بھی زیادہ ممد و معاون بن رہا ہے۔ مسلمان مقررین، مصنفین جرائد و رسائل محض ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر اب آہستہ آہستہ اس قسم کی زبان استعمال کرنے لگے ہیں۔ جس زبان کا آج سے دس برس پیشتر کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس کی بہترین شہادت سندر لال جی الہ آبادی کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مہاتما گاندھی کے نام لکھا تھا اور اب تو حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

> اُردو رسالوں میں وِدوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیئے۔ ایک مسلم اُردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہو گا کہ وِدوان (عالم) ایڈیٹر نے جواب دیا کہ ——"میں حجازی اُردو سے اپنے رسالہ کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا"۔ اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اُردو رسالوں میں ہو رہا ہے کسی ہندی رسالہ میں نہیں ہو رہا ہے۔ لاہور کے رسالہ نیرنگِ خیال سے میں نے اُردو نظم و نثر کے چند نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کانووکیشن ایڈریس میں نقل کئے تھے، جنہیں اگر آپ جوں کا توں حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ اُردو سے لئے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا۔ ...... آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سُندر ملی جلی زبان بولا کرتے تھے جسے سُن کر اُردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا، دونوں سمجھتے تھے۔ لیکن ناگ پور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دِلّی کے جامعہ میں چھپی ہے۔ وہ چیز نہیں ہے۔ (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کو اس کی ضرورت سے زیادہ رواداری نے اکثر تباہ کیا ہے۔ رواداری بڑی عمدہ چیز ہے بشرطیکہ وہ خودکشی پر آمادہ نہ کر دے —— دوسرے معاملات کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی یہ اپنی اسی رواداری سے کام لے رہا ہے۔ ہاتھ باندھ کر منتیں کرتا چلا جا رہا ہے کہ مہاراج! ہم اُردو کا نام بدل لیتے ہیں۔ ہم اس کے رسم الخط کو بھی درست کر لیں گے۔ ہم توبہ کرتے ہیں کہ اس میں عربی، فارسی کے الفاظ بھی نہیں لائیں گے۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ ہم

ہندی کے الفاظ کس کثرت سے اس زبان میں داخل کر رہے ہیں۔ ہم آپ کے ہر پرستاؤ کا سواگت کرتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سارے ہندوستان کی جنتا کے سماجی سدھار کے لئے ہے۔ پرنتو آپ سے کیول اتنی آشا ہے کہ ہمیں اس بھاشا کو زندہ رکھنے کی آگیا دے دیجئے۔ یہ روش بڑی تباہ کن ہے۔ اس کا کوئی مفید اثر غیر مسلموں پر نہیں پڑ سکتا۔ ان کو آپ کی زبان کی "دشواریاں" اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کرتیں بلکہ وہ جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے جس کے تحت اسپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی نادرۂ روزگار عمارات کے حسین و جمیل نقوش کو رگڑ ڈالے تھے، اس لئے نہیں کہ ان کو آرٹ سے کوئی دشمنی تھی، بلکہ صرف اس لئے کہ اسلامی خون رکھنے والی نسلوں میں ان نقوش سے اپنے ماضی کی اور اپنی قومیت کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت زبان سے "علیحدگی پسندی کے رجحان" کو مٹانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں اور مسلمان سمجھ رہا ہے کہ رواداری سے کوئی بین بین راستہ پیدا ہو جائے گا۔

تم ریڑھ کی ہڈی کے بغیر محض نرم گوشت بن کر اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر استقامت چاہتے ہو تو اپنے اندر ریڑھ کی ہڈی پیدا کرو۔ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ "اُردو مسلمانوں کی زبان ہے" تو کیوں نہیں کہتے کہ ہاں صاحب! یہ ہماری زبان ہے۔ ہماری زبان رہے گی۔ اور جب تک ہم موجود ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

یاد رکھئے زبان کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں جسے آپ یونہی ایک نظری بحث (ACADEMIC DISCUSSION) قرار دے کر آگے گذر جائیں اور اُردو زبان پر تاریخی مقالات لکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ آپ نے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ اُردو ہی ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان قرار پا سکتی ہے۔ یہ بحث اس سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اس لئے کہیں زیادہ قوتِ عمل کی محتاج۔ ذرا غور فرمائیے کہ آپ کے اسلامی تمدن اور مذہب کا تیرہ سو سال کا ذخیرہ اولاً عربی زبان میں ہے۔ ہندوستان کا مسلمان (سوائے عربی مکاتب کے چند طالب علموں کے) اس ذخیرہ سے بالکل ناآشنا ہو چکا ہے، اور اس لئے "اپنے متعلق" معلومات کے لئے مغرب کے مستشرقین کا محتاج ہے۔ وہ جس قسم کی معلومات ہم پہنچاتے ہیں، ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔ پھر اس خزانہ کا کچھ حصہ فارسی زبان میں ہے۔ یہاں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بھی بے بہرہ ہو چکا ہے۔ اس کے نزدیک کتب عربی اور فارسی کس درجہ مہمل ہو چکی ہیں۔ اس کا نظارہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کسی کباڑی کی دکان پر دیکھئے۔ نادرۂ روزگار کتابوں کے ڈھیر ردی کے بھاؤ بکتے ہیں۔ جمع شدہ ذخیرہ یوں ضائع ہو رہا ہے اور آئندہ ایک کتاب بھی ان زبانوں میں یہاں نہیں چھپتی۔ چھپے کس کے لئے؟ عربی اور فارسی یوں ختم ہوئی۔ اس کے بعد کچھ تھوڑا بہت سرمایۂ علمی اُردو میں منتقل ہوا تھا۔ اب جس وقت آزاد ہندوستان کی زبان ہندی (یا برائے فریبِ نگاہ ہندوستانی) ہو گئی تو آپ دیکھیں گے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں اُردو کا تمام ذخیرہ اسی طرح آثارِ قدیمہ والوں کی نذر ہو جائے گا، جس طرح آج عربی اور فارسی کا ہو چکا ہے۔ اور جب کوئی قوم اپنے اسلاف کے سرمایۂ علمی سے محروم ہو جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی تہذیب۔ تمدن۔ لٹریچر۔ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے —— انگریزوں نے یہاں پہنچ کر نہ تو انگریزی کو بالجبر رائج کیا۔ نہ عربی۔ فارسی کو جبراً اسکولوں سے خارج کیا۔ لیکن ایک سو سال کے عرصہ میں جو کچھ تبدیلی یہاں ہو گئی وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اپنی زبان پر غیروں کی زبان کے غالب آ جانے سے قوم کی ذہنیت بدل گئی، اور قوم کی قوم علمی سرمایہ کی اس متاعِ گراں بہا سے تہی دامن ہو گئی جو صدیوں

سے اس کے لئے مایۂ ناز تھی۔

رسم الخط کا مسئلہ

مسلمان کے لئے رسم الخط کا مسئلہ اس سے بھی اہم ہے۔ اُردو کا رسم الخط (دائیں سے بائیں طرف) عربی رسم الخط ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندی رسم الخط (بائیں سے دائیں طرف) سنسکرت کا رسم الخط۔ آپ کا رسم الخط تمام عالم اسلامی کے ساتھ آپ کا تعلق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات (جسے پان اسلامزم کا ہوّا بنا کر ڈرایا جاتا ہے۔) ہندوؤں کی نگاہ میں ہمیشہ سے کھٹکتے رہے ہیں۔ یہ تمام "معصوم کوششیں" جو بتدریج اُردو رسم الخط کی جگہ ہندی رسم الخط کی ترویج کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہیں، دراصل اسی جذبہ کا مظاہرہ ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو باقی عالم اسلامی سے الگ کر کے انہیں ہندی قومیت میں جذب کرنے کے لئے ہر ہندو کے دل میں موجزن ہے — یہ اتنا بڑا خطرہ ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمان بروقت آگاہ نہ ہوئے اور قومیت پرست مسلمانوں کے ہمدردی سے لبریز بیانات پر بھروسہ کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ وہ اپنی اصل سے اس طرح کٹ جائیں گے جس طرح فصلِ خزاں میں ایک شاخ درخت سے ٹوٹ کر گر پڑتی ہے اور جس کے لئے پھر کبھی مژدۂ بہار نہیں ہوتا۔ لیکن، جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے مصیبت تو خود یہاں اپنوں کی لائی ہوئی ہے۔ سی۔ پی میں اگر ہندی کی تعلیم لازمی کر دی گئی ہے تو مسلمانوں کو اس سے اتنی ہی شکایت ہوسکتی ہے کہ کانگریس، باوجود قومی جماعت کے ادعا کے خالص "فرقہ وارانہ" اقدام کر رہی ہے۔ لیکن سینۂ مسلم کا ناسور تو اس وقت رستا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ دہلی کے جامعۂ اسلامیہ میں، جو ایک آزاد اسلامی درسگاہ ہونے کی مدعی ہے۔ ابھی سے ہندی کی تعلیم جبری کر دی گئی ہے۔ جب اپنوں کی یہ حالت ہو تو غیروں کا کیا شکوہ۔

کہہ دیا جاسکتا ہے کہ تم نے انگریزی بھی تو سیکھی تھی، جس کا رسم الخط اُردو سے مختلف تھا؛ لیکن انگریزی سیکھنا تو غلامی کی لعنتوں میں سے تھا۔ اگر آزادی کی برکات کا نتیجہ بھی وہی کچھ ہوا تو دونوں میں فرق کیا ہوا؟ پھر انگریزی ہندوستان کی متحدہ زبان نہیں قرار دی گئی تھی، وہ حاکم قوم ہی کی زبان رہی تھی۔ اگر ہندو یہ اعلان کر دیں کہ ہندی، ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہے، جس کے ہاتھ میں نظامِ حکومت ہوگا اس لئے اقلیتوں کو یہ زبان سیکھنی پڑے گی، تو بات صاف ہو جائے۔ اس مقصد کو "متحدہ قومیت کے مشترکہ مفاد" کے نقاب میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟

پھر کہہ دیا جاتا ہے کہ ترکوں نے اپنا رسم الخط ترک کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا ہے، جو عربی رسم الخط سے مختلف ہے۔ تو تم بھی ایسا کر لوگے تو کیا حرج ہوگا۔ سو اوّل تو ترکوں کے حالات ہم سے مختلف ہیں۔ ان کی حکومت اپنی ہے۔ زبان اپنی ہے۔ انہوں نے معلوم نہیں کن مصالح کی بنا پر رسم الخط کو بدلا ہے۔ لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ترکوں کا یہ فیصلہ ہمارے لئے سند ہے؟ ہم اپنے فیصلے اپنے حالات کے مطابق خود کریں گے۔ ہمارے فیصلے ہندو اکثریت کیوں کرے؟

بعض حضرات کو کہتے سنا ہے کہ ہم ہندی رسم الخط اختیار کر کے اپنا سب لٹریچر ہندی میں منتقل کر دیں گے اور اس

طرح اسے ہندوؤں تک پہنچا کر اپنے مذہب اور تہذیب کی تبلیغ کر سکیں گے۔ بچگانہ پکڑنے کا یہ طریق ایسا "اُستادانہ" ہے جس کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ آج جتنے ہندو اچھی طرح سے اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں، پوچھئے کہ وہ آپ کے اسلامی لٹریچر کو کتنا پڑھتے ہیں اور ان کے خیالات کو آپ نے کس حد تک متاثر کیا ہے؟

پھر کہا جاتا ہے کہ اُردو میں ۸۰ فی صد الفاظ ہندی کے ہیں اس لئے اسے ہندی میں تبدیل کر دینے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے! لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ جب اُردو میں ۸۰ فی صد الفاظ ہندی کے ہیں جو ہندوؤں کی آبادی کے تناسب سے بھی زیادہ ہیں تو اسی زبان کو قومی زبان کیوں نہ قرار دے دیا جائے۔ مسلمانوں کا تو اس میں پھر بھی بیس فی صد ہی حصہ رہے گا۔ لیکن ہندو تو اتنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تو اسے سو فی صد ہندوانہ بنانا چاہتا ہے اور رسم الخط وہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو دنیا میں اس کے سوا اور کوئی نہ سمجھے۔ معلوم نہیں حکومت حاصل کر کے یہ باقی دنیا سے کس رسم الخط میں خط و کتابت کیا کریں گے؟ اُردو رسم الخط سے تو پھر بھی کم و بیش آدھی دنیا واقف ہے۔

نمونہ ہندوستانی"

آخر میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس "ہندوستانی" کا نمونہ بھی دکھا دیا جائے جو آپ کے آزاد ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے والی ہے۔ بھارت ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگ پور منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء کی صدارت کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، وہ یوں شروع ہوتا ہے:-

> "اس سبھا کا سبھا پتیتو دینے کا کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں، دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا، اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا۔ تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کیشتر بڑھا دیں گے۔ بدری ہم شری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبرو گڑھ تک جو پردیش ہے اُسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں۔ تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھوں بھوں بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی ایکتا لیکیہ سیوا کیوں نہ کریں" (رسالہ جامعہ مورخہ مئی ۱۹۳۶ء)

یہ ہے مولانا آزاد کے بیان کے مطابق وہ صاف و سلیس اُردو جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔

اس سے بھی دلچسپ ایک اور نمونہ ہے۔ بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے "ذریعۂ تعلیم" کے متعلق جو حکم حال ہی میں صادر فرمایا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:-

> "ہندوستانی زبان کو سنسکرت سے بھرنے یا فارسی سے ملانے کے خلاف اکثر یورپین اور ہندوستانی فضلاء نے آوازیں بلند کی ہیں، جن میں چند کے نام حسب ذیل ہیں۔ ......
> ...... میں ان میں سے فقط دو حضرات یعنی پنڈت گردھر شرما۔ اور مولانا وحید الدین سلیم

کے خیالات درج کرتا ہوں۔ پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"سنسکرت ماتا بنا کر آپ نے بنگال۔ مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار کیا۔ کنتو وہ کیول شکشتوں کی بھاشا بن گئی۔ سرو سدھارن ...... اسے بالکل نہ سمجھ سکے۔ تو کیا لابھ ...... ہوا۔ لابھ کیا بڑی ہانی ہو گئی ...... ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے شبد ہی پر کام لینے چاہیئے۔ لیکن جب ان سے ادشکتا پوری نہ ہو تب سنسکرت بھاشا سے سرل شبد لینے چاہئیں" (کلیم بابت اگست ۱۹۳۸ء)

یعنی پنڈت جی نے ہندوؤں کو نصیحت کی ہے کہ ہندی زبان کو ایسا سلیس لکھو کہ اس میں سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ نہ آئیں۔ لیکن جس زبان میں انہوں نے خود یہ پیغام دیا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے مہاراج بکرماجیت کے کسی نورتن کی ضرورت ہے۔ یہ ہے نمونہ آسان اُردو کا جو آپ کی مشترکہ زبان بنے گی۔ مولانا آزاد ان باتوں کے متعلق کسی بیان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ہندوؤں کے جی میں جو کچھ آئے کریں وہ معقول اور حق بجانب ہے۔ البتہ کبھی مسلمان کوئی شکایت کرے تو انہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہندوؤں کی صفائی پیش کر دیں۔ ان مثالوں کو شاید کوئی یہ کہہ کر مسترد کر دے کہ یہ کوئی مستند تھوڑی ہیں؟ آیئے ہم آپ کو ایک ایسا نمونہ دکھائیں جس کے مستند ہونے میں کسی کو کلام نہ ہو۔ صوبۂ متحدہ کی کانگریسی حکومت کے وزیر تعلیمات، آنریبل سری سمپورنا نند جی نے ایک تقریر کی۔ جس کا ترجمہ "ہندوستانی" زبان میں فوراً گورنمنٹ کے محکمۂ اطلاعات نے شائع کیا ہے۔ اس کے مستند ہونے میں تو کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا؟ ملاحظہ فرمایئے کہ یہ کونسی زبان میں ہے۔ واضح رہے کہ یہ زبان اس لکھنؤ سے شائع ہو رہی ہے جو ہندوستان بھر میں اُردو زبان کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تقریر مع عنوان یہ ہے:۔

شکشا سنگھٹن تتھ کے سمبندھ میں سنکیت پرانت کے شکشا سچیو مانیئے شری سمپورنا نند جی کا دیا کھیان (پرکاشن وبھاگ سنکیت پرانتیہ گورنمنٹ)

اس عنوان کے بعد تقریر کا متن ملاحظہ فرمایئے۔

ادھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں، اس کی یہ بھی ایک وشستا ہے کہ شکشت شریا کے برت لوگوں کا آگرشن بہت ورشدہ اور بیاپک ہو گیا ہے۔ یہ بات ادھکانش سبھیہ سنسار میں گھٹت ہوتی ہے، اور ورتمان سمے میں ہم اپنے دیش میں بھی اس وشیہ بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا انوبھو کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو جس راجنیتک اور پرادھینتا کی پرستھتی میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھتی کا جو سامایک راج نیتک اور آرتھک ادھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرتی پائی ہے اس سے اس وشیہ ویاپی پرگتی کو ہمارے سمکش ستدیو ایک بلشٹ روپ میں اپستھت کیا ہے اور ایک وشیش بھارتیئے سمسیہ بنا دیا ہے۔

ذرا آواز دیجئے مولانا آزاد صاحب کو اور ان سے پوچھئے کہ یہ "سلیس اُردو" جسے جنتر منتر والوں کی اصطلاح میں "کالا علم" کہا جائے گا، شمالی ہندوستان کے کس شہر میں بولی جاتی ہے؟

باب دوم

کچھ اپنوں سے

آپ نے دیکھا کہ اس آئینی تبدیلی کے دور میں "حصولِ آزادی" کی آڑ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی امتیازی خصوصیات مٹانے کے لئے ہندو اکثریت جو طریق کار اختیار کر رہی ہے۔ اس میں زبان کی تبدیلی کتنا زبردست حربہ ہے۔ لیکن سوال صرف یہی نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ وہ مسلمان جو ہندوستان میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کو مسلمان بنا کر رکھنا چاہتے ہیں انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ تحفظ زبان کے بارے میں ہمارے سامنے کیا تعمیری پروگرام ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق کسی دوسری صحبت میں گذارش کی جائے گی۔ اس وقت ہم چند باتیں اپنی "ادبی برادری" سے کرنا چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں سب سے اہم ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم زبان چاہتے کس لئے ہیں؟ زبان بذاتِ خود تو کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اس لئے محض اس کا تحفظ مقصود بالذات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زبان کا تحفظ ہم اس لئے چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہمارے تمدن، ہمارے کلچر کی حفاظت ہوتی ہے۔ لیکن کیا جو کچھ آج کل عام طور پر ہماری ادبی پیداوار ہے وہ ایسی ہی ہے جسے اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت کا آئینہ دار کہا جا سکے؟ جواب ظاہر ہے! ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایک جماعت تو ایسی ہے جس نے اپنی تمام مساعی کو اس بات کے لئے وقف کر رکھا ہے کہ مذہب اور شعائرِ ملت کے خلاف "جہادِ عظیم" کیا جائے۔ اول تو کالجوں کی تعلیم ہی اس نہج پر رکھی گئی ہے کہ بی اے کرنے تک دماغ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں، بلکہ متنفر ہو جاتا ہے۔ اس پر "آزادیٔ ہند کے قائدِ اعظم" کے یہ ارشادات کہ ملک میں جس قدر مصائب موجود ہیں، ان سب کا ذمہ دار مذہب ہے، نوجوانوں کو مذہب کی مخالفت نہیں بلکہ تضحیک و تمسخر کے لئے بالکل مسلح کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اشتراکیت کی ایک خیالی جنت کے نشہ میں اس قدر مدہوش و بے باک ہو جاتے ہیں کہ سوقیانہ استہزا اور بازاری تمسخر ان کے نزدیک عین معیارِ شرافت قرار پا جاتا ہے اور اس بدمستی میں بقول یلدرم ان کے منہ سے بوئے فحش کے ایسے بھپکے نکلتے ہیں کہ نکیریں بھی پناہ مانگیں۔

ایک اور جماعت ہے جو جدید رد مانیت کی علمبردار ہے۔ ہماری قدیم غزل گوئی کے خلاف ان کا وعظ سنیئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتذال اور سوقیانہ پن کا لفظ تک سننے کے لئے تیار نہیں۔ اس شاعری میں انہیں دنیا بھر کے عیب نظر آئیں گے لیکن انشا، رنگین، جرأت، جانِ صاحب، اور مرزا شوق کو مبتذل اور فحش گو کہنے والے ذرا یہ تو دیکھیں کہ جس قسم کی عریاں فحاشی ان کے افسانوں اور (SONATES) میں آج کل ملتی ہے، ان بے چاروں کے تصور میں بھی اس قسم کے لغتے نہ آ سکتے تھے۔ وہ تو پھر بھی ایک فرضی معشوق کی کشتی چوٹی ہی کو غایاں کرتے تھے۔ آج حالت یہ ہے کہ سچ مچ عشق بازی کی جاتی ہے اور نام لے لے کر واردانِ قلب کے مرقع تیار کئے جاتے ہیں جن سے اور کچھ نہیں تو ذہنی تعیش اور دماغی معصیت کوشی کی لذت تو ضرور مل جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس مغربی معاشرت کا نتیجہ ہے جو غیر محسوس طور پر ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ پر چھا گئی ہے اور جس کے تحت حیا سوز سفلی جذبات کے اظہار کا نام رعنائیت رکھا جاتا ہے۔ اگر

آپ کو دیکھنا ہو کہ اس رومانیت سے یورپ کی اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے تو ایک اطالوی مصنف کی کتاب (THE ROMANTIC AGONY) ملاحظہ فرمائیے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس قسم کی افسانہ نگاری اور شاعری کا اخلاق کے علاوہ نوجوانوں کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ایسے نوجوان کا دماغ شروع سے ہی حقائق کی دنیا میں رہنے کے بجائے ایک افسانوی دنیا کے تصورات و تخیلات میں محو رہتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ جب دنیا کی حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کو اپنے افسانوی معیار پہ پورا اُترتے نہیں دیکھتا، اس لئے وہ ان چیزوں سے بیزار ہو جاتا ہے۔ یاس و قنوطیت کا المناک فلسفہ اس کے تمام اعمال و افکار پر چھا جاتا ہے، اور وہی نوجوان جس کی قوتِ عمل سے قوم کو زندہ ہونا تھا، خود ایک چلتا پھرتا جنازہ بن کر رہ جاتا ہے۔

ایک تیسری جماعت اور ہے اور وہ (ART FOR ARTS SAKE)، (آرٹ محض آرٹ کی خاطر) کی قائل ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور جملے ایسے مہمل گورکھ دھندے ہیں، جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوتے۔ بے معنی تراکیب، بے مطلب فقرے۔ نثرِ منظوم، نظمِ منثور، ٹیگوری رنگ میں مجذوبوں کی سی بڑیں۔ نہ جن کا سر، نہ پاؤں، یا تو یہ لوگ، عمداً دوسروں کو بناتے ہیں، یا خود بنتے ہیں۔ غالب کے تتبع میں غزلیں کہی جاتی ہیں۔ جن میں شوکتِ الفاظ اور ندرتِ ترکیبات کے زور پر سننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

عصمتِ ناہید کو تر لو بہار نغمہ ہے — شعلۂ جوالہ ہے، اعتبار نغمہ ہے

بوئے رنگیں عنبر فشاں، مرمریں رنگِ شباب — کیف صہبائے تمنا، جوئبار نغمہ ہے

یا مثلاً نثر میں پیاز کی اُدھوکہ چھلکے پر سے چھلکہ اتارتے جائیے، اندر سے کچھ بھی نہ نکلے:۔

ریحانہ، لوز و سرو کی داستانِ شیریں، منجمد افسردہ، یاسمین کا بلوریں مجسمہ، گویا قدرت کا ایک حسین خواب تھا، جو رشید کی نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی سنہری راتوں میں بہارِ گلستاں، بدامن، کیف زا، نوائے رنگیں پیدا کرتی تھی۔

مقصد اس طویل داستان سے یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی اسلامی ہونا چاہیئے، بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں، کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع ایک عظیم خطرہ کا سامنا ہے، یہ وقت وہ ہے کہ جو کچھ جس کے بس میں ہو اس متاعِ گراں مایہ کی حفاظت کے لئے کر گزرے۔ یہی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ طریقِ کار خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہماری تمام جد و جہد کا رُخ اسی ایک نصب العین کی طرف ہونا چاہیئے۔ ادیب اپنے ادب سے، شاعر اپنے شعر سے، افسانہ نگار اپنے افسانوں سے، رسائل اپنے صفحات سے، خریدار اپنے ذوقِ ادب و شعر سے، غرض ہر مسلمان اپنے اپنے دائرۂ امکان میں اپنی ہر کوشش اسی مقصد کے حصول میں صرف کر دے۔ ہمارے رسائل میں "مذہبی" اور "ادبی" کی تفریق دراصل اس تفریق پہ مبنی ہے جو کلیسا اور سلطنت کی تفریق سے پیدا ہوتی ہے، اور جو یکسر غیر اسلامی تفریق ہے۔ ہمارے ہر پرچہ کو اسلامی ہونا چاہیئے، اور اس کی ادبی و صحافتی خدمات اسی عنوان کی تفسیرات ہونی چاہئیں۔ ادب پسند حضرات کو بھی اس تبدیلیٔ نصب العین سے قطعاً نہیں گھبرانا چاہیئے، کیونکہ "اسلامیات" اور "مولویات" میں بنیادی فرق ہے۔ لیکن آج کل ہمارے ہاں یہ حالت ہو چکی

ہے کہ کوئی پرچہ اپنی پیشانی پر "علمی و ادبی مجلہ" کا عنوان لکھ دیتا ہے، اسلام اور مسلم کا لفظ بھی اس کے اندر لکھنا کفر سمجھا جاتا ہے۔ ہم ادب و شعر کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ادب و شعر ہماری عمارت ملی کی بنیاد نہیں ہیں۔ محض تزئین و آرائش کی چیزیں ہیں۔ جب کسی عمارت کی بنیادیں خطرہ میں ہوں تو کوئی صاحب دانش و بینش اس وقت اپنی کوششیں اس کی تحسین و تزئین میں صرف نہیں کرتا بلکہ سب سے مقدم کام خود عمارت کے استحکام کو سمجھتا ہے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ جب ہم اس تبدیلی کا اعلان کریں گے تو اطراف و جوانب سے ہم پر انگلیاں اٹھیں گی۔ لیکن بقول مولانا حالی "دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔"

آخری گزارش

آپ نے دیکھ لیا کہ اس "تحریک آزادی" میں آپ کے لئے کیسی کیسی خوبصورت "زنجیریں" تیار ہو رہی ہیں۔ اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ زنجیریں کیا کریں گی، تو ہندوستان کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے۔ یہاں یونانی آئے، پارتھین آئے، باختری آئے، ہن آئے، اور متعدد قومیں یکے بعد دیگرے آئیں۔ لیکن آج ذرا چراغ لے کر ڈھونڈو اور دیکھو کہ ان قوموں کا کہیں سراغ بھی ملتا ہے؟ یہ قومیں ہندوستان سے واپس نہیں گئیں۔ آخر کیا ہوئیں، کیوں نظر نہیں آتیں؟ اس کا جواب تاریخ یہ دیتی ہے کہ انہوں نے خود فراموشی کا جرم کیا تھا، اس لئے فنا ہو گئیں۔ جب یہ ہندوستان آئی تھیں تو اپنی الگ زبان، الگ تہذیب، الگ تمدن، الگ مذہب رکھتی تھیں، مگر انہوں نے اپنے امتیازی خصائص کی حفاظت نہ کی، اپنے آپ کو اس ملک کی عام آبادی میں جذب کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ صرف افسانے رہ گئے۔ کیا آپ یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے بجائے صرف آپ کے افسانے باقی رہ جائیں؟

اور راز حیات صرف اس حقیقت میں مضمر ہے کہ ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

آپ اپنا مذہب۔ اپنا تمدن۔ اپنی تہذیب۔ اپنی زبان۔ اسی صورت میں قائم رکھ سکتے ہیں کہ آپ اپنی جماعت کو بحیثیت مستقل جماعت کے قائم رکھیں۔ وہ بینا الایات لقوم یعقلون ۵

تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کی زبان —— اُردو —— کو مٹانے کے لئے کیا کچھ کیا، اس کی تفصیل کے لئے پھر اتنے ہی طویل مقالہ کی ضرورت ہو گی، جتنا طویل مقالہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں۔ اختصار کی غرض سے ہم اس سلسلہ میں مسٹر (K.L. GUABA) کی کتاب (PASSIVE VOICES) سے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں جو پاکستان میں ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں مسٹر گابا لکھتے ہیں:-

قومی زبان کی تلاش کے سلسلہ میں، شمالی ہند کے ہندوؤں نے کوشش کی ہے کہ اپنی زبان سے مسلم اثرات کو خارج کر دیا جائے...... وہاں سرکاری مقاصد کے لئے جو زبان استعمال کی جاتی ہے

وہ، وہ ہندی ہے، جس میں سنسکرت کی بھرمار ہوتی ہے۔ ان مقاصد کے لئے اُردو کو دیس نکالا مل چکا ہے اور اسکولوں اور عدالتوں میں اس کی سخت حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مسلمان نہ اپنی شکایات کو حکومت تک پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی مقابلہ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کر سکتے۔ وہ ہندی، مرہٹی اور گجراتی سیکھتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی انہیں حصولِ ملازمت میں کامیابی نہیں ہوتی۔ (ص ۳۶۳)

ان اشارات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اُردو زبان کی وہاں کیا حیثیت رہ گئی ہے۔

اور اب آیئے پاکستان کی طرف ـــ پاکستان کا مطالبہ اور حصول اس بنا پر تھا کہ مسلمان اشتراکِ دین کی بنیادوں پر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں۔ (اسے دو قومی نظریہ کہتے ہیں) تشکیلِ پاکستان کے بعد، سب سے پہلے اسی نظریہ کو خیرباد کہا گیا اور اشتراکِ وطن کی بنا پر، پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا گیا۔ مسلمانوں کی وحدتِ قومی کی یہ بنیاد یوں ختم ہوئی۔

اگر اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر اُمت کی تشکیل ہو جائے تو مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمان خواہ کوئی زبان بولیں اس سے وحدتِ اُمت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اگر اس بنیاد پر اُمت کی تشکیل نہ ہو، یا اس میں ہنوز پختگی پیدا نہ ہوئی ہو تو وحدتِ زبان، قومی یک جہتی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے قائداعظم نے فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہوگی۔ انہوں نے یہ اعلان مشرقی پاکستان جا کر کیا تھا اور مشرقی پاکستان ہی سے اس کی مخالفت ہوئی، اور سخت مخالفت۔ سطح بین نگاہیں اس کا محرک محض اپنی "مادری زبان" (بنگلہ بھاشا) سے جذباتی لگاؤ سمجھتی تھیں، لیکن بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ اس کا جذبہ محرکہ خالصتہً سیاسی تھا جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوا۔

اُدھر سے فارغ ہونے کے بعد، وہی پاکستان دشمن قوتیں، اب مغربی پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں۔ اس کے لئے یہاں پہلے، چار قومیتوں کے نظریہ کو ابھارا گیا۔ اس کے بعد اسے علاقائی (صوبائی) تعصبات اور جداگانہ زبانوں کے فروغ کے نگاہِ فریب پردوں میں چھپایا گیا، اور پھیلایا جا رہا ہے ـــ لوگ گیت، لوگ ناچ، علاقائی لباس اور دیگر خصوصیات کی نمائشیں اور حوصلہ افزائیاں۔ اور آخر الامر علاقائی زبانوں کی نشوونما۔ سب اس خطۂ زمین (مغربی پاکستان) کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی سحر آفریں سازشیں ہیں۔

زبان کے مسئلہ میں پنجاب زیادہ سخت جان واقعہ ہوا ہے۔ اس میں، دور دراز علاقوں کے دیہات تک کی بڑی بوڑھیاں بھی اپنے عزیزوں کو اُردو زبان میں خط لکھتیں اور اُردو ہی میں ان کا جواب سنتیں اور سمجھتی تھیں۔ اب اس کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائی جا رہی ہے۔ چنانچہ ۱۲ جون ۱۹۷۵ء کے روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع شدہ ایک خبر کی رُو سے، یہاں ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ جس میں "بے نصیب پنجابیوں" سے کہا جا رہا ہے کہ تم "پنجابی بولو ـــ پنجابی پڑھو ـــ پنجابی لکھو"۔ حتیٰ کہ ان کی غیرت کو اپیل کرنے کے لئے یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ یہ

"جو پنجابی کسی دوسری زبان میں بات چیت کرتا ہے، وہ خدا کی قسم جھوٹ بولتا محسوس

ہوتا ہے اور جو پنجابی، اپنی ماں کی بولی بولنا، لکھنا اور پڑھنا اپنی بے عزتی سمجھتا ہے وہ بڑا
ہو کر ضرور اپنی ماں کو ماں کہنا ہتک سمجھے گا۔" (یہ عبارت ہے لاہور سے شائع ہونے والے
ایک "پنجابی جایا" کے پوسٹر کی۔) [1]

ہندوستان میں ہندو، ایک مشترکہ زبان کی وضع و ترویج سے متحدہ قومیت کی تشکیل چاہتے تھے، اور یہاں (نام نہاد) علاقائی ثقافتوں اور زبانوں کے احیاء و فروغ سے کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ اتنا سا خطۂ زمین بھی متحد نہ رہ سکے ——— ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

اور یہ سازشیں ان کے ہاتھوں پروان چڑھ رہی ہیں جو یا تو تحریکِ پاکستان کے بدترین اور دریدہ دہن مخالفین میں سے تھے اور یا ان کا اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں تھا ——— اور قیامت بالائے قیامت کہ یہ حضرات خیر سے حکومت کے ایوانوں میں براجمان ہیں، اور خود حکومت کے خزانۂ عامرہ کا زرِ کثیر بالواسطہ یا بلاواسطہ ان مدّات پہ صرف ہو رہا ہے۔

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد

---

[1] پنجاب کے سال آئندہ کے بجٹ میں "پنجابی ثقافت" کیلئے بھی کچھ روپیہ رکھا گیا ہے۔ "تہنیت گویم خواجہ افراق را"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared.
and die not except in a state of Islam. And hold fast,
all together, by the Rope which God stretches out
for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO
INDUSTRIES LIMITED

United PTI 5/23

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

نقد و نظر

(حیات الحدیث)

نام کتاب :- اضواء علی السنۃ المحمدیۃ۔ از علامہ محمود ابوریّہ مصری۔
شائع کردہ :- دار المعارف مصر۔ صفحات :- بڑی تقطیع ۴۲۲
پاکستان میں :- المکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں جس کے عنوان کا لفظی ترجمہ "سنتِ نبوی پر روشنی" ہے۔ احادیث رسولؐ کی "حیات" یعنی زندگی بیان کی گئی ہے۔ اس وقت اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے اور غالباً کتاب کے پہلے ایڈیشن کا نام "حیات الحدیث" تھا۔ جیسا کہ کور کے آخری صفحہ پر تعارف سے معلوم ہوتا ہے۔

علامہ محمود ابوریّہ علمائے مصر میں اپنی علمی تحقیق کے لئے مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں خوشگوار تاثر یہ ہے کہ وہ اپنی کسی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے بلکہ دوسرے اہلِ علم کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زیرِ تبصرہ کتاب کا پہلا ایڈیشن ساری دنیا کے ممتاز علماء کی خدمت میں بھیجا اور کتاب کے آخری صفحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے افغانستان، عراق، زنجبار، حجاز، مصر اور شام نے فاضل مصنف کے اس تحقیقی کام کی تعریف کی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس میں پاکستان کا، جو بزعم خویش بڑے بڑے علمائے دین کا مرکز ہے کا ذکر تک نہیں۔

کتاب لکھنے کی ترغیب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو کتاب زیرِ تبصرہ لکھنے کی ترغیب استاد سید رشید رضا مرحوم کی تحریروں سے ہوئی، جن میں آپ نے مسلمانوں کی موجودہ زوال پذیر صورتِ حالات کو سامنے رکھ کر احادیثِ نبویؐ پر بحث کی، جن میں سے بعض کا ذکر اس کتاب میں بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً اہلِ شام کی بابت مشہور احادیث ہیں کہ وہاں اتنی تعداد میں ابدال ہیں۔ (یہ صوفیا کے نزدیک روحانی حکمرانی کا سب سے اونچا عہدہ ہے، اور یہ صاحب عامۃ الناس کی نظروں سے اوجھل رہ کر ان کی حفاظت اور رزق کا سامان کرتے ہیں،) اور یہ کہ یہ ابدال اہلِ شام کی مدد کرتے رہتے ہیں، اور انہی کی طفیل انہیں رزق ملتا ہے۔ ان احادیث کو اس حد تک معتبر قرار دیا گیا ہے کہ کسی اہلِ علم کو ان پر اعتراض کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ تاہم جب سنہ ۱۹۲۶ء میں فرانس نے شام کو کچل کر رکھ دیا تو اہلِ شام تباہ حال ہو کر بھوکے ننگے ہو کر مرنے لگے۔ ان پریشان کن حالات کو سامنے دیکھتے ہوئے علامہ رشید رضا نے علماء سے دریافت کیا کہ اہلِ شام کے وہ ابدال

کہاں گئے۔ (صفحہ ۱۳۴) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ایسی ہی جھوٹی روایات نے امتِ مسلمہ کو زوال کے گڑھے میں گرا دیا ہے اور کتنے دکھ کی بات ہے کہ وہ محنت سے رزق کمانے کی بجائے اس اعتقاد میں پختہ ہو گئے ہیں کہ انہیں یہ رزق قبروں میں دفن مردوں کے ذریعے ملتا ہے۔ (صفحہ ۱۳۵) آگے چل کر حضرت کعب احبار کے تذکرہ میں فاضل مصنف اسے اسرائیلی روایت ثابت کرتے ہیں۔

مصنف کی تحقیق اور بحث کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے افکار کا جو خلاصہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلامی احکامات و اعتقادات میں احادیث بھی قرآن مجید کی طرح سند کی حیثیت رکھتی ہیں تو پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی طرح امتِ مسلمہ کو کوئی متفقہ مجموعہ احادیث عنایت کرنے سے کیوں محروم رکھا۔ اب حالت یہ ہے کہ بعض ائمہ کے نزدیک جو احادیث صحیح ہیں وہی دوسرے ائمہ کے نزدیک ضعیف ہیں۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے ہو گی۔ امام بخاری اور امام مسلم کو صحتِ حدیث کے لئے سند سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جن راویوں سے انہوں نے احادیث روایت کی ہیں، حدیث کے ایک دوسرے امام النسائی نے ان راویوں کو ضعیف قرار دے کر ان کی روایت کردہ احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ (صفحہ ۱۳۱)

روایت بالمعنی اس کتاب کی دوسری اہم تحقیق یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس احادیث کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ سب کا سب لفظ بلفظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں۔ بلکہ وہ روایت بالمعنی کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ یعنی ایک راوی نے دوسرے راوی سے احادیث کے الفاظ نقل نہیں کئے، بلکہ اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ جس کی وجہ سے ایک ہی موضوع کی مختلف احادیث کے الفاظ میں کافی تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس بارے میں انہوں نے بڑی لمبی چوڑی بحث کی ہے اور بہت سے دلائل دیئے ہیں، جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ افصح العرب، یعنی عرب کے سب سے بڑے فصیح تھے، لیکن اس کے باوجود ائمہ لغت و نحو نے جہاں قرآن مجید اور زمانۂ جاہلیت کے اشعار کو بطور سند پیش کیا ہے، وہاں انہوں نے احادیثِ نبوی سے ایسا نہیں کیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ احادیث کو روایت بالمعنی کے ذریعے زیادہ تر عجمیوں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے جس کی بنا پر انہیں فصیح عربی کے لئے بطور سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔ (صفحہ ۳۷)

اسرائیلیات اسرائیلی روایات کا ایک معتدبہ ذخیرہ جس کی بنیاد توریت اور تالمود پر تھی احادیثِ نبوی میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے علماء بھی ان اسرائیلیات کی مذمت کرتے ہیں، لیکن ان کی نشاندہی کے لئے انہوں نے کوئی حتمی اصول مقرر نہیں کئے۔ جبکہ اکثر اوقات ان اسرائیلیات کی مذمت کرنے والے خود انہی روایات کا سہارا لیتے ہیں۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ جن راویوں کے ذریعے یہ اسرائیلیات، احادیثِ نبوی کے مجموعوں میں داخل ہوئی ہیں۔ انہیں اب بھی حدیث لٹریچر میں بلند ترین مقام دیا جاتا ہے۔ فاضل مصنف کی تحقیق کے مطابق یہ روایات زیادہ تر حضرت کعب الاحبار، وھب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام کی معرفت ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ تینوں حضرات یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ کعب الاحبار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھا اور آپ کی نبوت کی سچائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن ایمان کی نعمت سے محروم رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسلام اتنی جلدی اتنا طاقتور نہیں ہو جائے گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب اس نے دیکھا کہ

ساری دنیا اسلام کے سامنے سرنگوں ہو چکی ہے تو وہ اسلام لے آیا۔[1] اس حساب سے آپ کا درجہ تابعی کا ہے۔ (صفحہ ۱۴۷) لیکن غلطی سے آپ کو صحابی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ فاضل مصنف کی تحقیق کے مطابق جب آپ نے یہودی مکر و فریب کے ذریعے اسلامی تعلیمات میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تو حضرت عمرؓ آپ کی چالوں کو فوراً پہچان گئے اور احادیث روایت کرنے سے منع فرما دیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ ایسا کرنے سے باز نہ آئے، تو انہیں شہر بدر کر دیا جائے گا۔ (صفحہ ۱۵۳) اس کے بعد فاضل مصنف نے تفصیلی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے قتل میں کعب الاحبار کا بھی ہاتھ تھا، تاکہ وہ ان کی وفات کے بعد اپنی مکر و فریب کی روایات کو آزادی سے بیان کر سکے۔[2] (صفحہ ۱۵۳، ۱۵۴)

حضرت عمرؓ کی اس احتیاط کے باوجود کعب الاحبار کی ہزاروں روایات احادیث نبویؐ کا حصہ بن گئی ہیں یہاں تک کہ چند صحابہؓ نے جن میں حضرت ابوہریرہؓ بھی شامل تھے، کعب الاحبار تابعی سے احادیث رسول اللہؐ روایت کی ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ رسول اللہؐ کے صحابہؓ جنہیں حضورؐ کی صحبت کا شرف حاصل تھا، ایک ایسے شخص سے احادیث روایت کرتے ہیں جو آپؐ کی وفات کے کئی سال بعد ایمان لایا۔ پھر فاضل مصنف ان اسرائیلی روایات کی جھلک دکھاتے ہیں جو دینِ اسلام کا حصہ بن چکی ہیں۔ انہی میں معراج نبویؐ کی وہ روایت بھی ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کی تھیں، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہؐ کو دس دفعہ اللہ تعالیٰ کے حضور واپس بھیج کر انہیں پانچ نمازیں کرائی تھیں (صفحہ ۱۴۴) اس پر فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ، جس نے اپنے بندوں پر نماز فرض کی، اسے اتنا علم بھی نہیں تھا کہ اس کے بندے کتنی نمازیں ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ نے بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس کر کے پچاس سے پانچ کرائیں۔ اور پھر خود رسول اللہؐ ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت کی طرف اپنا برگزیدہ نبی بنا کر بھیجا تھا، انہیں (معاذ اللہ) اتنا بھی اندازہ نہیں تھا کہ آپ کی اُمت کتنی نمازیں پڑھنے کی ہمت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ نے دس بار انہیں رب کے حضور واپس بھیج کر ان کی تعداد کم کرائی۔ (ایضاً)

ایسی روایات نقل کرنے کے بعد فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء ایک طرف تو اسرائیلیات کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف مزے لے لے کر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔[3]

---

[1] یہ صاحب حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی نہیں۔ بلکہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلام لائے تھے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] تفصیل پرویز صاحب کی کتاب "شاہکارِ رسالت" میں ملے گی۔ (طلوعِ اسلام)

[3] اور ایسا "بچی روٹی کے ملّا" ہی نہیں کرتے۔ ہمارے زمانے کے جدید ترین مفسر (سید ابوالاعلیٰ مودودی) بھی (جنہیں ان کے معتقدین امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا ہم پایہ قرار دیتے اور "اللہ کا شاہکار" کہہ کر پکارتے ہیں۔) ان روایات کو اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

عیسائی روایات

اسی طرح تمیم بن اوس الداری اور ابن جریج نے ایسی عیسائی روایات کو احادیثِ نبویؐ میں داخل کر دیا، جو قرآنی تعلیمات کے خلاف ہیں، لیکن ہم نے آنکھیں بند کر کے انہیں قبول کر لیا ہے، اور یہ دیکھنے تک کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ وہ کس حد تک قرآنی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ (صفحہ ۱۸۲)

حضرت ابوہریرہؓ کی ساڑھے پانچ ہزار روایات

حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق فاضل مصنف نے یہ تحقیق کی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں صرف ایک سال / نو مہینے رہے، اور آپ سے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار احادیث روایت کی ہیں — جبکہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ نے جو آپ کی صحبت میں بیس بیس پچیس پچیس سال رہے، یا تو آپ سے کوئی حدیث ہی روایت نہیں کی (جیسے حضرت سعیدؓ بن زید ابن نفیل جو عشرہ مبشرہ سے تھے اور اُبیّ بن عمارہؓ وغیرہم)۔ یا اگر احادیث روایت کی ہیں تو ان کی تعداد بہت کم ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ سے امام بخاریؒ نے صرف بائیس احادیث روایت کی ہیں۔ امام ابن حزم کی تحقیق کے مطابق حضرت عمرؓ سے صرف پچاس احادیث ثابت ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ سے بھی جو سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہے، پچاس سے زیادہ احادیث ثابت نہیں، جن میں سے امام بخاری و مسلم نے صرف بیس نقل کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ بن عوام اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے صرف نو نو احادیث امام بخاریؒ نے روایت کی ہیں، اور حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ اور حضرت سلمان الفارسی سے صرف چار چار۔ (صفحہ ۲۲۵)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایات سب صحابہؓ سے زیادہ ہیں، لیکن ایک موقعہ پر وہ بیکسر نفسی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کی روایت کردہ احادیث ان سے زیادہ ہیں۔ حالانکہ ان کی تقریباً ساڑھے پانچ ہزار احادیث کے مقابلے میں اُن کی صرف سات صد احادیث ملتی ہیں، جن میں سے امام بخاریؒ نے صرف سات کو اپنی کتاب میں نقل کرنا مناسب سمجھا ہے۔ (صفحہ ۲۱۰)

حضرت عمرؓ کی دھمکی

احادیث میں ہر قسم کے رطب و یابس بیان کرنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے انہیں (حضرت ابوہریرہؓ کو) سرے سے احادیث روایت کرنے ہی سے روک دیا، اور دوبارہ ایسا کرنے پر انہیں ملک بدر کرنے کی دھمکی دی، جس کی وجہ سے وہ ایسا کرنے سے رُک گئے۔ لیکن حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد انہوں نے یہ سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ اسی لیے علامہ رشید رضا نے کہا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کی وفات حضرت ابوہریرہؓ کے بعد ہوتی تو ہم تک ان کی ساڑھے پانچ ہزار احادیث میں سے ایک بھی نہ پہنچتی۔ (صفحہ ۲۱۰ بحوالہ مجلہ المنار۔ جلد ۱۹ صفحہ ۱۰)

حضرت عائشہؓ سے بے ادبی

اس کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کے لگ بھگ عمر پائی تھی، اس لئے وہ آپ کی اکثر روایات کو جھٹلا دیتی تھیں۔ فاضل مصنف نے وہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ جب جھوٹ ظاہر ہو جانے پر حضرت ابوہریرہؓ نے اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کو بے ادبانہ جواب دیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتنا عرصہ رہنے کے باوجود

ہمیں آپؐ کی روایت کردہ احادیث کا علم نہیں۔ تو حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا:۔
شَغَلَكَ عَنْهُ صلی اللہ علیہ وسلم المراۃ والمکحلۃ۔ (رواہ بخاری وابن سعد وابن کثیر)
(ترجمہ) کہ آپ کو بناؤ سنگھار سے ہی فرصت نہیں تھی کہ حضورؐ کی باتوں کی طرف متوجہ ہوتیں۔ (صفحہ ۲۰۴)
فاضل مصنف نے ایسی بہت سی احادیث کا ذکر کیا۔ ان میں سے ایک کا بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شاعری کی مذمت

(مثلاً) حضرت ابوہریرہؓ نے یہ روایت بیان کی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ کسی شخص کا خون اور پیپ سے پیٹ بھر لینا اس سے اچھا ہے کہ وہ شاعری سے اُسے پُر کرے۔ حضرت عائشہؓ نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

من ان یمتلی شعرا ھجیت بہ

(ترجمہ) یعنی ایسے اشعار سے پیٹ بھرنا کہ جس میں تو نے کسی کی بدگوئی کی ہو۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام حضرت عائشہؓ کی تردید کو جو زیادہ معتبر ہے، تو نہیں لیتے، لیکن اس کے مقابلے میں حضرت ابوہریرہؓ کی مذکورہ بالا نامکمل روایت کی بنا پر شاعری کو حرام قرار دیتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں ان تفصیلات کو نقل کرنے کے بعد فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ مجھے ان علماء کے طرزِ عمل پر حیرت ہوتی ہے کہ اگر کوئی امام حدیث مثلاً یحییٰ بن معین یا علی بن المدینی کسی راوی کی ایک روایت کو جھوٹا قرار دیں تو اس کی دوسری روایات بھی قبول نہیں کی جاتیں۔ لیکن حضرت ابوہریرہؓ کو حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے خلفائے راشدین اور اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ جیسی ہستیوں نے جھوٹا قرار دیا ہے اور اس کے باوجود ان کی ہزاروں روایات دین اسلام کا حصہ بن گئیں۔ (صفحہ ۲۲۱)

جھوٹی احادیث سے استدلال

فاضل مصنف اس امر کا بھی بڑے افسوس سے ذکر کرتے ہیں کہ بڑے بڑے علمائے دین بعض احادیث کو جھوٹا سمجھتے ہوئے بھی ان پر اپنے استدلال کی بنیادیں اٹھاتے ہیں۔ مثلاً امام شافعیؒ کے مقابلے میں امام ابوحنیفہؒ کا رتبہ بڑھانے کے لیے یہ حدیث وضع کی گئی:۔

"یکون فی امتی رجل یقال لہ محمد بن ادریس أضرّ علی أمتی من ابلیس، ویکون فی امتی رجل یقال لہ ابوحنیفہ۔ ھو سراج امتی۔ (صفحہ ۱۲۱)

(ترجمہ) حضورؐ نے فرمایا کہ "میری امت میں محمد بن ادریس نامی ایک شخص (یعنے امام شافعیؒ) ہوگا، جو میری اُمت کے لئے شیطان سے بھی زیادہ ضرر رساں ثابت ہوگا ــــ اور میری اُمت میں ایک شخص ابوحنیفہ نامی ہوگا، جو میری اُمت کا چراغ ہوگا۔" اس حدیث کے وضعی ہونے کے باوجود بڑے بڑے حنفی فقہا نے اپنی کتابوں میں اس حدیث کے حوالے سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کو سراج الامت کے خطاب سے موسوم کیا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۲)

حضرت ابن عباسؓ نے صرف چار احادیث سنی تھیں

فاضل مصنف علامہ آمدی کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ صغر سنی کی وجہ سے حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہؐ سے صرف چار احادیث سنی تھی (صفحہ ۷۱) لیکن بعد میں

ان کے نام سے سینکڑوں احادیث مشہور ہو گئیں۔

جرح و تعدیل

ائمہ حدیث کے نزدیک احادیث کے سچا اور جھوٹا ہونے کا معیار راویوں کے سچا اور جھوٹا ہونے پر ہے جبکہ اس بارے میں تلخ حقیقت یہ ہے کہ جو راوی ایک امام، مثلاً یحییٰ بن سعید القطان کے نزدیک سچا ہے، وہی راوی اس فن کے ایک دوسرے امام مثلاً عبدالرحمٰن بن مہدی کے نزدیک جھوٹا ہے (صفحہ ۲۶۳) اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کے غلام عکرمہؒ کو بہت سے ائمہ نے جھوٹا قرار دیا، اور اسی جھوٹ کی تہمت کی وجہ سے امام مسلمؒ نے ان کی روایت کردہ کوئی حدیث قبول نہیں کی لیکن اس کے باوجود انھوں نے احادیث اور تفسیری روایات سے دنیا کو بھر دیا (صفحہ ۲۶۴) اس سلسلے میں بعض اوقات عجیب عجیب چیزیں سامنے آتی ہیں (مثلاً) امام شافعیؒ نے امام واقدیؒ کو اور امام سفیان الثوریؒ نے امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف راوی قرار دیا ہے۔ اسی طرح امام یحییٰ بن معینؒ نے امام شافعیؒ کو اور امام الذھلی نے امام بخاریؒ کو متہم قرار دیا ہے حالانکہ یہ سب ہستیاں اُمتِ مسلمہ کے جلیل القدر ائمہ ہیں۔

صحیح احادیث کا علم الہام سے ملتا ہے

اس سلسلے میں ایک اور سنگین صورت سامنے آئی اور وہ یہ کہ جرح و تعدیل کے معیار پر پرکھنے کے بعد جو احادیث ضعیف اور جھوٹی ثابت ہوتی ہیں، خود جرح و تعدیل کے یہ ائمہ ان سے استدلال کرتے ہیں۔ ان ائمہ کی توجہ جب اس طرف دلائی گئی تو اس فن کے ایک بہت بڑے امام عبدالرحمٰن بن المہدیؒ نے فرمایا کہ دراصل صحیح احادیث کی پہچان الہام سے ہوتی ہے اور اس طرح جرح و تعدیل کا وہ علم جس پر وہ ساری عمر جان کھپاتے رہے، اسے یک قلم منسوخ کر دیا۔ (صفحہ ۲۸۷)

صحتِ احادیث کا علمی معیار

مصنف نے کتاب کے آخر میں امام محمد عبدہٗ کی زبانی صحتِ احادیث کا معیار پیش کیا ہے، جسے وہ قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں۔ یعنی ایسی تمام احادیث جو قرآن حکیم، علمی تحقیقات اور عقل کے خلاف ہوں، وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں۔ چاہے وہ ائمہ حدیث کی نظر میں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں۔ (صفحہ ۲۷۷) اس کے بعد اسی قسم کی احادیث کی کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے ایک ذاتی واقعہ یاد آ گیا۔ ہمارے شہر کے ایک قدامت پسند عالمِ دین اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کرنے کے لیے مفتی محمد عبدہٗ کی علمی تحقیقات کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے اور طلوعِ اسلام کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے راقم پر اکثر چوٹیں کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ ایک علمی مجلس میں امام محمد عبدہٗ کی تعریف کر رہے تھے تو راقم نے عرض کیا کہ حدیث کے بارے میں پرویز صاحب کا بھی وہی مسلک ہے جو مفتی محمد عبدہٗ کا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک بھی صرف وہ احادیث قابلِ قبول ہیں جو قرآنی تعلیمات، علمی تحقیقات اور عقل کے خلاف نہ ہوں۔ بقیہ احادیث جو قرآنی تعلیمات کے مطابق ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ انہیں تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان سے استدلال بھی کرتے ہیں۔ تو ان روشن خیال بننے والے صاحبِ علم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

حرفِ آخر

مصنف نے اس کتاب کی تیاری میں بڑی محنت کی ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان خالص علمی اور تحقیقاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام کے اہلِ علم نے ان کی اس کوشش کو سراہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارے علماء اس تصنیف کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور اگر انہیں کوئی علمی خامی نظر آئے تو وہ اسے علمی دلائل کی رو سے مصنف تک پہنچا کر عنداللہ ماجور ہوں۔

مولانا مودودی صاحب اسے مزاجِ شناسِ رسولؐ کی بصیرت کہہ کر پکارتے ہیں اور مرزا غلام احمد اپنا کشف و الہام (باوجی) (طلوعِ اسلام)

(۲) دعوتِ ارواح

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

ہمارے زمانے میں یہ لات و منات، پہلے مغرب کی سیکولر جمہوریت کی شکل میں نمودار ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے کمیونزم کا روپ دھارا جو تاریخِ انسانیت میں سب سے زیادہ تباہ کن ابلیسی حربہ ہے۔ کمیونزم کی ٹیکنیک یہ ہے کہ نوجوان نسل میں فحاشی اور اخلاق سوزی کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے، اور پرانی نسل کے لوگوں میں جو مذہب سے وابستہ ہوں، مسلکِ خانقاہیت کو عام کیا جائے۔ اقبالؒ نے اپنی مشہور نظم — "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" — میں کمیونزم کی اس ٹیکنیک کو، ابلیس کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے کہ (ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا کہ) ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے : تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

یوں تو آجکل تمام ترقی پذیر ممالک کمیونزم کی ابلیسی سازشوں کی آماجگاہ ہیں، لیکن پاکستان پر اس کی خصوصی توجہ ہے۔ یہ اس لیے کہ اسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اور اسے خطرہ تھا کہ اس خطۂ زمین میں کہیں اسلام کا احیاء نہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ابلیسی سازش کا پہلا حصہ (یعنی نوجوانوں میں اخلاق سوزی کے جراثیم کا عام کرنا) کس قدر کامیاب ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے دوسرے حصہ (یعنی مسلکِ خانقاہیت کی نشر و اشاعت اور فروغ) کے کامیاب کرنے میں کیا کیا کوششیں ہو رہی ہیں وہ بھی کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ مزار پرستی، عرسوں کی تقاریب، قوالیوں کی بھرمار، اور دیگر خرافات کا جس قدر ہجوم اب ہو رہا ہے، تشکیلِ پاکستان کے وقت اس کا عشرِ عشیر بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ (اور اس میں خیر سے محکمہ اوقاف نمایاں کردار ادا کر رہا ہے) علاوہ ازیں مسلکِ خانقاہیت سے متعلق لٹریچر جس قدر آب و تاب اور کثرت سے اب شائع ہو رہا ہے، گذشتہ زمانے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی سلسلہ میں، حال ہی میں (۱۹۷۴ء میں) ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے، "دعوتِ ارواح" مصنف ہیں "محمد ارشد قادری، جامعہ صوفیہ، پناہ کے شریف" اور جسے ادارہ "المعارف" گنج بخش روڈ، لاہور نے بڑے دیدہ زیب انداز سے شائع کیا ہے۔ ناشرین کے بیان کے مطابق، "روح کی حقیقت و ماہیت، احضارِ ارواح اور ان سے اکتسابِ فیض پر یہ ایک معیاری کتاب ہے"۔ اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ کے لئے تو ایک تصنیف کی ضرورت ہوگی۔ مختصر الفاظ میں ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ قوم کے قوائے عملیہ کو مضمحل اور نوجوان طبقہ کو اسلام سے برگشتہ تر ہی نہیں بلکہ متنفر کرنے کے لئے اس کے بعد شاید ہی کسی اور کوشش کی ضرورت پڑے۔ اس کے "پیش لفظ" کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے :-

میرا مقصد ان تمام اختلافات کو پیش کرنے کا ہے کہ ہر مسئلہ پر ہر زمانہ میں سوچا اور غور کیا گیا

ہے۔ جس طرح زمین و آسمان اور ماحول کی تمام مادی چیزوں کے متعلق ہر زمانے میں آنے والے علماء نے غور و خوض کیا ہے اور جیسے ذاتِ خداوندی پر مختلف تصورات پیش کئے ہیں اسی طرح انسان نے یہ بھی سوچا ہے کہ میں کیا ہوں اور یہاں اس دنیا میں میرے آنے کا مقصد کیا ہے، اور کیا میں جب مر جاؤں گا تو پھر بھی کوئی میری حقیقت باقی رہے گی۔ لہٰذا روح اور حیات بعد الممات کا مسئلہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اس وقت سے یہ مسائل موضوعِ بحث بنے ہوئے ہیں اور یہ سوال قدیم ترین عہد سے انسان کے سامنے رہا ہے۔ اس کتاب کا موضوع بھی یہی ہے کہ روح کیا ہے اور مرنے کے بعد بھی کیا روح باقی رہتی ہے؟ ... اور اگر یہ روح لافانی ہے اور باقی ہے تو کیا اس سے ہم مل بھی سکتے ہیں اور جس طرح دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان سے مل کر استفادہ کرتا رہتا ہے۔ کیا روح سے بھی استفادہ ممکن ہے؟ ... یہ وہ سوالات ہیں جن پر دنیا بھر کے فلاسفروں، سائنس دانوں اور صوفیوں نے مدتوں بحث و نظر کی ہے اور اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان سب نظریوں کو بھی پیش کیا جائے گا اور پھر اپنا عقیدہ بھی پیش کروں گا۔ وما توفیقی الا باللّٰہ۔

اس کے بعد عنوان ہے "نفسِ مضمون"۔ اس کے اندر وہ تمام اہم نکات درج کئے گئے ہیں جن پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ اس میں روح کی متعدد اقسام بھی دی گئی ہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ان تمام نکات پر بحث کرنے کے لئے ایک مبسوط تصنیف کی ضرورت ہے۔ ان میں سے چند ایک اہم نکات کو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اور سر پیٹئے:۔

۱۔ روح کو حاضر کرنے کی مجلس

"ایک گول اور ہلکی میز بنوائیں جس کے پائے تین ہوں۔ میز کے اوپر پاک و صاف کپڑا ڈال دیں۔ اس کپڑے کو عطر لگا کر معطر کر دیں۔ کچھ خوشبودار پھول میسر ہو سکیں تو وہ بھی میز پر رکھ لیں۔ ایک پاک و صاف اور علیحدہ مقام تجویز کریں۔ اگر مکان ڈیوڑھی میں ہو تو وہ زیادہ موزوں رہے گا۔ وہاں درمیان میں میز رکھ دیں اور بالکل اندھیرا کر دیں۔ چھ آدمی ایسے تجویز کریں جو مذکورۃ الصدر مشقیں[1] کر چکے ہوں۔ ان آدمیوں میں پانچ کو ممبر بنا لیں اور ایک کو ان کا امیر یا پریذیڈنٹ بنا دیں۔

اب وہ صدرِ مجلس ان پانچ آدمیوں کو حکم دے کہ وہ دو دو نفل اس طرح پڑھیں کہ سورۂ فاتحہ کے بعد سو بار سورۂ اخلاص پڑھیں۔ اب صدر انہیں میز کے اردگرد بیٹھنے کا حکم دے اور خود صاحبِ صدر، اس مجلس کے اردگرد آیت الکرسی سے حصار کرے تاکہ کوئی شیطانی، جناتی چیز اور ہمزاد وغیرہ آ کر دھوکہ نہ دے سکے۔ اب اس میز کے اردگرد بیٹھ کر جس روحانی کو بلانا مقصود ہو اس روحانی کو ان نوافل کا ایصالِ ثواب کر دیں۔ اوّل آخر درود شریف پڑھ لیں۔ پھر اس میز کے اردگرد اس طرح بیٹھیں کہ ان کے ہاتھ میز پر رکھے ہوں۔ میز پر ہاتھوں کا دباؤ نہ پڑے۔ اجسام کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ ہاتھ اس طرح رکھیں کہ ہر ایک ممبر اور صدر کا ہاتھ ایک دوسرے سے لگا ہوا ہو۔ یعنی چھنگلی ایک دوسرے سے ملی

---

[1] یہ جانکاہ مشقیں کتاب میں دی گئی ہیں۔

ہوئی ہو اور اپنے دونوں انگوٹھوں کو بھی ملائے رکھے۔ ہاتھ کی انگلیاں مس کریں۔ لیکن جسم ایک دوسرے سے مس نہ کرے۔ یہاں تک کہ کپڑا بھی ایک دوسرے کو نہ لگے۔ اب سب اس روح کا تصور کریں جسے بلانا مقصود ہو۔ اگر اس کا فوٹو دیکھ چکے ہوں تو پھر آسانی سے تصور جم سکے گا۔ ورنہ اس کے اوصاف یا اس کی قبر یا اس کے ماحول کا تصور جمائے۔ یا پھر اس کے نام کا تصور کرے اور صدر مجلس سورۂ یٰسین کی آہستہ آہستہ تلاوت کرے۔ جب "سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" پر پہنچے تو سب ہمراہ اس آیت کو دہرائیں۔ بار بار پڑھیں اور روح کو تصور سے اپنی طرف کھینچیں اور اور اپنی قوتِ ارادی سے یوں سمجھیں کہ بس وہ آگئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ممبروں کو اپنے ہاتھوں میں ایک قسم کی سنسناہٹ اور گرمی سی محسوس ہونے لگے گی۔ زبردست خوشبو کا جھونکا مشامِ دماغ کو معطر کر دے گا۔ یا آپ پر رقت طاری ہو جائے گی۔ آپ کا بے ساختہ رونے کو جی چاہے گا۔ یا آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ ذکر جاری ہو جائے گا۔ اگر اس حالت میں حلقہ ٹوٹ جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر آپ کو ہوش ہے تو "سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" کا ورد آہستہ آہستہ کرتے رہیں۔ کبھی کبھی میز بھی حرکت میں آجائے گی۔ آنکھیں بند رکھیں۔ اگر آپ کی ملکوتی نگاہ کام کر رہی ہے تو زیارت نصیب ہوگی۔

اب، صدر حلقہ اس روحانی سے بات چیت شروع کرے۔ سب سے پہلے یہ مطالبہ کرے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے طاقت دی ہے کہ آپ مجسم ہو کر ہمیں اپنی شکل و صورت کی زیارت بھی کرا سکتے ہیں۔ لہٰذا زیارت کرائیے تاکہ حاضرینِ مجلس کو آپ جیسے روحانی بزرگ کی تشریف آوری کا عین الیقین ہو جائے۔ پھر اس کے بعد فیض عنایت کرنے کا مطالبہ کرے کہ آپ نے جو زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا ہے، اس فیض کی ہم لوگ آپ سے بھیک مانگتے ہیں۔ آپ اپنے فیض کی زکوٰۃ ہی دے دیں۔ اگر کسی صورت سے بھی وہ فیض دینے کے لئے تیار نہ ہو تو اس سے اپنی سلب کرنے والی قوت سے کچھ فیض سلب کر لے۔ جب کام نکل آئے تو روح کو واپس جانے کی اجازت دیں، اور کہیں کہ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ ان کی تشریف آوری اور اس تکلیف دہی کا شکریہ ادا کریں۔

اگر ان چھ آدمیوں میں سے ایک بھی ناقص ہو تو تمام کا کام بگاڑ کر رکھ دے گا۔ دورانِ عمل ڈر اور خوف کو ہرگز پاس نہ لائیں۔

قوتِ ارادی کے کچے اور غیر مستقل مزاج اور نفسانی آدمی مس میں قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتے۔

شروع شروع میں اگر کامیابی نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ باللہ آپ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اپنا پیر و مرشد یا اپنے سلسلہ کا روحانی پیشوا بہت جلد حاضر ہو سکتا ہے۔ یا جس بزرگ سے بہت زیادہ عقیدت و محبت ہو وہ فوراً حاضر ہو کر فیض دے گا۔" (صفحہ ۲۷۹ - ۲۸۱)

فرمائیے! اس قسم کی خرافات کے بعد قوم کے فعال طبقہ کو عضو معطل بنانے اور نوجوان نسل کو اسلام گزیدہ کرنے کے لئے، کچھ اور کرنے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ اب آگے بڑھئے۔ عنوان ہے:

ارواح کا مجسم ہو کر دیدار کرنا

(الف) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دادا صاحب کا مجسم ہو کر آنا
اور اس عنوان کے تحت مذکور ہے۔

شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں :-

میری ہمشیرہ بیمار تھی۔ گھر کی عورتیں اس کے گرد یاس و قنوط کے عالم میں بیٹھی تھیں اور میں ساتھ کے کمرے میں تنہا سو رہا تھا۔ یکایک میں نے دیکھا کہ حضرت والد صاحب مرحوم تشریف لے آئے۔ فرمایا کہ لڑکی کو دیکھنے آیا ہوں۔ ذرا اس کے اور عورتوں کے درمیان پردہ کرا دو۔

میں نے اٹھ کر مریضہ اور عورتوں کے درمیان چادر لٹکا دی۔ حضرت والد صاحب آگے بڑھے۔ مریضہ کے سر پر ہاتھ رکھا — دعا کی اور فرمایا۔ بیٹی! تیری تکلیفیں ختم ہو گئیں۔ انشاء اللہ صبح کو تو اچھی ہو جائے گی۔ یہ کہا اور کمرے سے نکل گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چلا تو آپ نے اشارہ سے روک دیا اور چند قدم آگے چل کر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں حیرت و استعجاب سے کھڑا سوچتا تھا کہ حضرت کا تو عرصہ سے انتقال ہو چکا ہے۔ آج یہاں کیسے آ گئے۔ اسی روز میری ہمشیرہ کا بھی انتقال ہو گیا، اور وہ حضرت والد صاحب کے فرمان کے بموجب طویل علالت سے نجات پا گئیں۔ (۲۵۴ - ۲۵۵)

(ب) حضرت شاہ عبدالعزیز کے پاس حضرت ابوہریرہؓ کا مجسم ہو کر آنا

فتاویٰ عزیزی میں لکھا ہے۔ جب مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے سال کی تراویح میں قرآن مجید ختم کیا۔ اچانک ایک شخص زرہ بکتر سے آراستہ، علم ہاتھ میں پکڑے ہوئے تراویح کے بعد تشریف لائے اور پوچھنے لگے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کس جگہ تشریف رکھتے ہیں؟ یہ بات سن کر جملہ حاضرین اس کے قریب آ گئے اور بہت حیران ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ان کا نام دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میرا نام ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) ہے۔ سرکار مدینہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آج عبدالعزیز نے قرآن پاک ختم کیا ہے۔ ہم وہاں تشریف لے جائیں گے۔ مجھے کسی اور کام کے لئے بھیجا ہوا تھا۔ اس وجہ سے دیر ہو گئی۔ یہ فرمایا اور غائب ہو کر نظر سے روپوش ہو گئے۔ (۲۵۵)

ان "واقعات" کے متعلق ہم اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ یہ قرآن کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان دنیا میں دوبارہ نہیں آ سکتا۔ سورۂ مومنون میں ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۙ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ (۲۳/۹۹-۱۰۰)

تا آنکہ جب ان لوگوں کے سرہانے جو غلط راستہ پر چلتے تھے موت آ کھڑی ہوئی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے ایک بار پھر دنیا میں واپس بھیج دے تو میں بہت اچھے اچھے کام کروں، اس سے کہا جائے گا کہ یہ تیری آرزو تے خام ہے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان مرنے والوں کے پیچھے قیامت تک پردہ حائل ہے۔ اب یہ پیچھے نہیں جا سکتے۔

سورۂ زمر میں اس حقیقت کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے:۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط (۳۹/۴۲)

موت اور نیند دونوں حالتوں میں خدا نفس (ذات) کو معطل کر دیتا ہے۔ پھر موت کی صورت میں اسے روک لیتا ہے۔ واپس نہیں آنے دیتا۔ لیکن نیند کی صورت میں اسے بیداری کے وقت واپس کر دیتا ہے۔

اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ جب خدا موت کے بعد انسانوں کو (نفس انسانی کو) روک لیتا ہے تو کس کی مجال ہے کہ یا تو وہ خود اس دنیا میں واپس آ سکے یا کوئی اور اسے لا سکے؟

مدارجِ ارواح

اس عنوان کے نیچے ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

حکیم نیر واسطی "لاہور" جنگ کے دنوں میں وطن عزیز سے باہر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ عمرہ کرنے کے بعد جب روضۂ اطہر کے لئے مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں کے مشہور بزرگ، حضرت مولانا عبدالغفور مہاجر مدنی، نے دورانِ ملاقات فرمایا کہ ایک رات خواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زیارت ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نجف اشرف سے کیسے تشریف لائے تو فرمایا۔ پاکستان پر کفار حملہ آور ہیں۔ اس لئے وہاں جہاد میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں۔ (۱۸۱ - ۱۸۲)

جنگ کے زمانے میں اس قسم کے بہت سے افسانے مشہور ہو گئے تھے جن پر طلوعِ اسلام میں تفصیلی تبصرہ کیا گیا تھا۔

روح کی عالمِ بیداری میں ملاقات

پہلے لکھا ہے:۔

"انبیاء علیہم السلام، شہدائے کرام اور اولیائے عظام کی ارواح کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اجسام لطیفہ کو متشکل اور ظاہر کر کے اس عالم میں جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد صحیح مسلم کی روایت کے حوالے سے تحریر ہے کہ:۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ارواح مختلف اشکال اختیار کر سکتی ہیں جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعظیم و تکریم کے لئے انبیاء علیہم السلام نے اپنے حقیقی اجسام میں متشکل ہو کر بیت المقدس میں حضور کے پیچھے نماز پڑھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضور علیہ السلام نے قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام کو حج کرتے دیکھا۔ (۱۸۶)

حضرات انبیاء کرام کی تعداد، ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ اگر یہ تمام حضرات اپنے اجسام کے ساتھ

بیت المقدس میں جمع ہوئے تھے تو اندازہ لگائیے کہ ان کے لئے کس قدر جگہ درکار ہوگی؟ اور پھر قرآن کریم کی بیان کردہ اس حقیقت کے متعلق کیا کہا جائے گا جس میں اس نے بصراحت کہا ہے کہ:-

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝

تم اس زندگی کے بعد مر جاؤ گے اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔ (۲۳/۱۵-۱۶)

قرآن کریم کی ان تصریحات کے پیش نظر یہ تصور کرنا کہ موت کے بعد انسان اس دنیا میں دوبارہ آسکتا ہے یکسر خلافِ اسلام نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کا ارشاد

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بیداری کے عالم میں اپنی ملاقات کا ذکر فرماتے ہیں۔

"(تو وہ) مدت سے حضرت خضر علیہ السلام کے احوال کی نسبت دریافت کیا کرتے تھے۔ چونکہ فقیر کو ان کے حال پر پوری پوری اطلاع نہ دی گئی تھی، اس لئے جواب میں توقف کیا کرتا تھا۔ آج صبح کے حلقہ میں دیکھا کہ حضرت الیاس اور حضرت خضر علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام روحانیوں کی صورت میں حاضر ہوئے اور روحانی ملاقات سے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم عالم ارواح میں سے ہیں۔ حق سبحانہٗ وتعالےٰ نے ہماری ارواح کو ایسی قدرتِ کاملہ عطا کی ہے کہ اجاسم کی صورت میں متمثل ہو کر وہ کام جو جسموں سے وقوع پذیر ہوں، ہماری ارواح سے صادر ہوتے ہیں۔ اس اثناء میں پوچھا کہ کیا آپ امام شافعیؒ کے مذہب کے موافق نماز ادا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ہم شرائع کے مکلف نہیں، لیکن چونکہ قطب مدار کے کام ہمارے سپرد ہیں اور قطب مدار امام شافعیؒ کے مذہب پر ہے، اس لئے ہم بھی اس کے پیچھے امام شافعیؒ کے مذہب کے موافق نماز ادا کرتے ہیں۔" (صفحہ ۱۸۹)

اس سلسلہ میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ "حضرت خضر" کا زمرۂ انبیاء کرامؑ میں شامل ہونا تو درکنار یہ نام تک قرآن کریم میں نہیں آیا۔

خلیفۃ روحیں

"حدیث شریف میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے جنگِ بدر میں مارے گئے کفار سے بات چیت فرمائی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ حضورؐ! کیا ارواح مرنے کے بعد بھی سنتی ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا۔ تم سے زیادہ سنتی ہیں۔" (صفحہ ۱۰۸)

اس روایت کے وضعی ہونے کے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ نصِ قرآنی کے خلاف ہے۔ مُردوں کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ:- فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ (۳۰/۵۲) "تو مُردوں کو کبھی نہیں سنا سکتا"

حضرت شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی کا بیان

چار اولیاء اللہ قبروں میں زندہ ہیں۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے فرمایا تھا کہ میں نے اولیاء اللہ

(باقی بر صفحہ ۶۱)

خریداروں کی خدمت میں!

مرے کو مارے شاہ مدار، ہوشربا گرانی پہلے ہی ہمت شکن تھی کہ محصول ڈاک کے حالیہ اضافہ نے اور بھی کمر توڑ دی۔ اس کا جو اثر رسالہ طلوع اسلام اور کتابوں کی خریداری پر پڑے گا۔ اُسے مختصراً درج ذیل کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس میں سے ادارہ کو کچھ نہیں ملے گا۔ یہ سب حکومت کے خزانۂ عامرہ میں جائے گا۔

۱۔ عام ڈاک کے ذریعہ اندرون ملک رسالہ بھیجنے پر چونکہ محصول ڈاک میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس لئے ہم بھی اس میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔

۲۔ جب رسالہ بذریعہ رجسٹری یا وی پی بھیجا جائے گا تو چونکہ رجسٹریشن کا خرچ ساٹھ پیسے سے بڑھ کر نوے پیسے ہو گیا ہے اس لئے ان چیزوں میں تیس پیسے کا اضافہ ہوگا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خریدار حضرات اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں تو انہیں فی سے پیسے کی بچت ہوگی۔

۳۔ پارسلوں کے وزن پر بھی محصول ڈاک کا اضافہ ہوا ہے۔ لہٰذا جب کتابیں بذریعہ پارسل (وی پی یا عام رجسٹری) بھیجی جائیں گی تو ان پر زیادہ خرچ آئے گا۔ کتابیں منگاتے وقت اس کا خیال رکھا جائے۔

۴۔ پیشگی خریدار حضرات جب کتابیں منگواتے ہیں تو ان کا ڈاک خرچ ہم خود برداشت کرتے ہیں۔ یہ ڈاک خرچ اب کافی زیادہ ہوگا، لیکن ہم تا بہ حدِ برداشت اسے خود ادا کرتے جائیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ پیشگی خریدار بننے میں آپ کو خاصا فائدہ رہے گا۔ اس کے لئے کرنا صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ ایک صد روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ ہم مطلوبہ کتابیں آپ کو بلا محصول ڈاک بھیجتے رہیں گے اور ان کی اصلی قیمت آپ کے حساب سے وضع ہوتی رہے گی۔

۵۔ جہاں تک بیرونِ پاکستان خریداروں کا تعلق ہے ان پر اس اضافہ کا زیادہ اثر پڑے گا۔ بنابریں حفاظت ان سب کو رسالہ بصیغۂ رجسٹری بھیجا جاتا ہے اور رجسٹریشن فیس زیادہ ہو گئی ہے۔ بنابریں ہم مجبور ہو گئے ہیں کہ بیرونِ پاکستان رسالہ کا سالانہ چندہ ڈیڑھ پونڈ کے بجائے دو پونڈ کر دیا جائے۔ امید ہے قارئین ہم سے تعاون کریں گے، اور اس بوجھ کو برداشت کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

۶۔ جو حضرات ہوائی ڈاک کے ذریعہ رسالہ منگاتے ہیں انہیں ہوائی ڈاک کا محصول الگ ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ محصول ڈاک اب قریب ڈیڑھ گنا ہو گیا ہے۔ لہٰذا ان حضرات سے اب یہ خرچ نئے ریٹ کے مطابق وصول کیا جائے گا۔ جن خریداروں کے ہمارے پاس پیشگی کھاتے ہیں۔ یہ زائد خرچ ان کھاتوں سے محسوب کر لیا جائے گا۔ جن کے کھاتے ہمارے پاس نہیں ہیں انہیں ہم اطلاع دیں گے وہ براہ کرم زائد خرچ ہمیں ویسے ادا کر دیں۔

ہم خریدارانِ کرام کے تعاون کے متمنی اور اس کے لئے پیشگی شکر گزار ہیں۔

حقائق و عبر

ثقافتِ اسلامیہ کے کچھ نمونے

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور کے ماہنامہ المعارف میں "ملفوظاتِ خواجہ بندہ نواز، گیسو دراز" کے عنوان سے ایک مقالہ بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت بابت جون ۱۹۷۵ء کی ..... میں اس مقالہ کی جو قسط شائع ہوئی ہے، اس کے دو تین اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ (مقالہ نگار ہیں پروفیسر محمد اسلم صاحب) تحریر ہے:۔

"حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ ایک بزرگ نے یہ وصیت کی، جب وہ فوت ہو جائے تو سات روز تک اس کی میت کے قریب ہنگامۂ سماع برپا کیا جائے اور بعد ازاں اسے دفن کیا جائے۔ جب وہ بزرگ فوت ہوا تو حسبِ وصیت اس کی میت کے پاس محفلِ سماع منعقد ہوئی۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ساتویں روز وہ اٹھ کر رقص کرنے لگا اور بالآخر چارپائی پر گر گیا۔"

دوسرا معجزہ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے:۔

"حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں کہ ایک بار ایک بدعقیدہ شخص ایک بادشاہ سے ملا اور اس نے بادشاہ کو صوفیوں سے بدظن کر دیا۔ بادشاہ نے حکم صادر کیا کہ صوفیوں کو شہر سے نکال دیا جائے۔ جب یہ فرمان صوفیا تک پہنچا تو انہوں نے درخواست کی کہ انھیں تین دن کی مہلت دی جائے تاکہ وہ اپنے ہمسایوں اور ملنے والوں کو الوداع کہہ سکیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بادشاہ سے یہ بھی درخواست کی کہ انہیں آخری بار مجلسِ سماع منعقد کرنے کی اجازت دے دے، بعد ازاں وہ شہر چھوڑ جائیں گے۔

بادشاہ نے ان کی درخواست منظور کر لی اور اپنے محل کے سامنے ایک سائبان نصب کر کے صوفیوں کو وہاں سماع منعقد کرنے کی دعوت دی اور خود ایک جھروکے میں بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگا۔ اتفاق سے اس کا ایک خورد سال بیٹا بھی اس کے پاس کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ اچانک نیچے گر گیا اور اس کے جسم کے اعضا زمین پر بکھر گئے۔ بادشاہ کو بیٹے کی وفات کا بڑا رنج ہوا اور اس نے خیال کیا کہ یہ سب کچھ انہی بدبخت صوفیوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ

ابھی صوفیوں سے بدلہ لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ صوفیوں کو اس سانحہ کا علم ہو گیا۔ انہوں نے بادشاہ کو یہ پیغام بھیجا کہ اس بچے کی میت کو یہاں بھیج دے اور جب وہ سماع سے فارغ ہوں گے تو اس کا بچہ زندہ و سلامت اس کے حوالے کر دیں گے، بعد میں جو اس کے جی میں آئے اُن کے ساتھ کرے۔ صوفیوں کی درخواست پر اس بچے کے اعضا کو ایک دری میں لپیٹ کر مجلسِ سماع میں رکھ دیا اور صوفی حسبِ سابق سماع میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد دری میں حرکت پیدا ہوئی تو صوفیوں نے حاضرین سے کہا کہ اسے کھولیں۔ جب لوگوں نے دری کھولی تو وہ بچہ اٹھ کر بھاگ گیا۔ جب بادشاہ نے یہ ماجرا دیکھا تو حجرہ کے نیچے اُتر آیا اور ان صوفیوں کی خاک پا اپنی داڑھی پر ڈالنے لگا۔ بعد ازاں اس نے اپنے سلوک کی معافی مانگی اور ان سے بے حد تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔"

ایک اور:

"حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں جب باؤلی کھودی گئی تو وہاں سے کھاری پانی برآمد ہوا۔ حضرت کے خادم اقبال نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ باؤلی سے بڑا کھاری پانی نکلا ہے۔ اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو لوگ اس سے بڑا فائدہ اٹھاتے۔ خواجہ اقبال کی بات سن کر حضرت نے فرمایا کہ انہیں کسی روز مجلسِ سماع میں یہ بات یاد دلانا۔ چند روز بعد جب حضرت کی خانقاہ میں مجلسِ سماع منعقد ہوئی تو خواجہ اقبال نے انہیں وہ بات یاد دلائی تو حضرت نے قلم، دوات اور کاغذ طلب فرمایا۔ خواجہ اقبال نے یہ تینوں چیزیں حضرت کی خدمت میں پیش کیں تو حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر اسے دیا اور فرمایا کہ اسے باؤلی میں ڈال دے۔ حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں کہ جوں ہی وہ تعویذ باؤلی میں ڈالا گیا، اس کا پانی میٹھا ہو گیا۔"

یہ ہے اس اسلامی ثقافت کا نمونہ جس کے احیاء اور فروغ کے لئے یہ ادارہ قائم ہوا ہے اور جس کے لئے اسے حکومت کی طرف سے گرانٹ بھی ملتی ہے! کیا اس کے بعد بھی یہ پوچھنے کی ضرورت رہے گی کہ ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ مذہب سے متنفر کیوں ہوتا جا رہا ہے؟

۲۔ ہماری تاریخ میں کیا ہے؟

ساہیوال سے شائع ہونے والے ماہنامہ "الرشید" میں، امام عبداللہ ابن مبارکؒ (متوفی ۱۸۱ھ) کی مشہور تصنیف "کتاب الزہد والرقائق" کا ترجمہ بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ اس کا جو حصہ مئی ۷۵ء کی اشاعت میں چھپا ہے اس کے حسب ذیل دو مندرجات قابلِ غور ہیں:

(۱) "حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر اس امت کے پہلے بزرگوں میں سے دو شخص اپنے

مصحف لے کر کسی وادی میں نکل آئیں، تو وہ لوگوں کے پاس ایسی حالت میں آئیں گے کہ جن اعمال پر وہ گامزن تھے ان میں سے کسی کو نہیں پہچانیں گے۔"

(۲) ۔ حضرت عائشہ رضؓ نے حضرت لبیدؓ کے یہ دو شعر پڑھے۔

(ترجمہ) وہ لوگ چل بسے جن کی حفاظت میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ اور میں ایسے لوگوں میں رہ گیا جو خارشی اونٹ کی کھال کی مانند ہیں۔

وہ ڈرتے ہوئے اور کسی کی پناہ لیتے ہوئے بات کرتے ہیں اور ان سے گفتگو کرنے والا معیوب ہوتا ہے، اگرچہ اس نے فساد برپا نہ کیا ہو؟

اس کے بعد لکھا ہے:۔

حضرت عائشہ رضؓ نے حضرت لبیدؓ کے مندرجہ بالا دو شعر پڑھ کر فرمایا کہ اگر حضرت لبیدؓ ان لوگوں کو دیکھ لیتے جن میں ہم رہتے ہیں تو پھر کیا فرماتے؟ .... حضرت زہریؒ نے اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر حضرت عائشہ رضؓ ان لوگوں کو دیکھ پاتیں جن میں آج ہمارا رہنا ہے تو پھر کیا فرماتیں؟

آپ کو معلوم ہے کہ یہ گفتگو کس دور کے بارے میں ہو رہی ہے؟ دورِ صحابہؓ اور تابعینؒ کے؟ حضرت لبیدؓ صحابی تھے۔ ۴۱ھ میں وفات پائی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضؓ کی وفات ۵۷ھ میں ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ (صحابی) نے ۷۳ھ میں وفات پائی۔ اور (حضرت) محمد زہریؒ ابن شہاب کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی۔ یہ جلیل القدر تابعین میں سے تھے۔ گویا، (امام ابن مبارکؒ کے قول کے مطابق) رسول اللہؐ کی وفات کے پچیس تیس سال بعد (یعنی حضرت لبیدؓ کی وفات سے قبل دورِ صحابہؓ کے) مسلمانوں کی حالت وہ ہو چکی تھی جس کا ذکر حضرت لبیدؓ نے اشعار میں کیا۔ حضرت عائشہ رضؓ نے ان سے پندرہ سولہ سال بعد کے لوگوں کو (جو اصحاب اور تابعین پر مشتمل تھے) حضرت لبیدؓ کے زمانہ سے بھی گیا گذرا بتایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے عہد کے مسلمانوں کا رونا رویا ۔۔۔ اور جناب زہریؒ نے اپنے زمانہ کی حالت ان سے بھی ابتر بتائی۔

اگر خود ہماری پیش کردہ تاریخ کی روشنی میں، مخالفین یہ کہیں کہ کیا یہی تھا وہ انقلاب عظیم جسے قرآن کریم کی تعلیم اور رسول اللہؐ کی تربیت نے عربوں کی حالت میں پیدا کیا تھا، اور یہی تھی صحابہ رضؓ اور تابعین رحؒ پر مشتمل وہ اُمت جسے آپ ساری دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں، تو فرمائیے کہ آپ کے پاس اس اعتراض کا کیا جواب ہوگا! حضرت لبیدؓ کا انتقال ۴۱ھ میں ہوا تھا اور حضرت عائشہ رضؓ کا ۵۷ھ میں۔ یہ دور (۴۰ھ تک) تو خلافتِ راشدہ کا زمانہ تھا!

(ہماری تاریخ کی صحیح پوزیشن سمجھنے کے لئے پرویز صاحب کی شہرہ آفاق تصنیف، شاہکارِ رسالت ملاحظہ فرمائیے)

۳۔ عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

ایک دوست کے حسنِ رسالت سے ایک تراشہ موصول ہوا ہے جس میں مندرج واقعہ نے ہمارے قلب و نگاہ کے

ساتھ کیف و سرور کا دریا میکدہ وا کر دیا ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ قارئین کو اس سے محروم رکھا جائے۔ ملاحظہ فرمایئے اور لطف اندوز ہوجئیے:-

عظیم فرانسیسی مصوّر (PIERRE AUGUSTE RENOIR) بڑھاپے میں وجع المفاصل کے سخت اذیت رساں مرض کا شکار ہو گیا، جس نے اس کی انگلیوں کو گرفت کے قابل نہ چھوڑا۔ اس کے ایک دوست نے دیکھا کہ اس کے باوجود وہ تصویر کشی میں مصروف ہے۔ اس نے برش کو اپنی انگلیوں کے پوروں سے تھام رکھا ہے، لیکن اس کی ہر حرکت سے ایسا شدید درد اٹھتا ہے کہ اس سے اس کا دم نکل جاتا ہے۔ اس (دوست) نے اس سے کہا کہ آپ اس قدر شدید درد کے باوجود تصویر کشی کیوں کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ:-

THE PAIN PASSES BUT THE BEAUTY REMAINS

درد تو چلا جائے گا، لیکن حسن باقی رہ جائے گا!

قرآن کہتا ہے کہ: مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (16/96)

ALL THAT IS WITH YOU PASSETH AWAY WHILE WHAT IS WITH ALLAH ABIDETH

اور اقبالؔ سے

نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا — اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا!
ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام — جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

یکم اگست ۱۹۷۵ء سے طلوع اسلام کا سالانہ چندہ

۱۔ پاکستانی خریداران ــــــــــــــــــــ ۱۵/- روپے

۲۔ (غیر ممالک) بذریعہ بحری ڈاک رجسٹرڈ = ۲ پونڈ ــــــــــــــ ۴۴/- "

۳۔ (غیر ممالک) بذریعہ ہوائی ڈاک برائے (۱) برطانیہ۔ سوئٹزرلینڈ۔ فرانس وغیرہ۔ ۴۴/- + ۴۴/۴۰ = ۸۸/۴۰ "

(۲) دبئی۔ بحرین۔ مسقط۔ شارجہ۔ کویت۔ سعودی عرب۔ ابوظہبی۔ قطر۔ سری لنکا اور افغانستان ــ ۴۴/- + ۲۰/۴۰ = ۶۴/۴۰ "

(۳) لیبیا۔ کینیا۔ یوگنڈا۔ جنوبی افریقہ۔ ــ ۴۴/- + ۳۹/۶۰ = ۸۳/۶۰ "

(۴) امریکہ۔ کینیڈا وغیرہ ــ ۴۴/- + ۹۲/۴۰ = ۱۳۶/۴۰ "

باب المراسلات

یہ قصۂ ماضی ہے۔ اسے اب چھوڑو بھی!

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں "طلوعِ اسلام" میں جب بھی مولانا ابوالکلام آزاد یا مولانا حسین احمد مدنی (مرحومین) کا ذکر کیا جاتا ہے تو ہمیں اکثر و بیشتر اس قسم کے خطوط موصول ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جن کا ملخص حسب ذیل ہے:۔

> تحریکِ پاکستان اب قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ وہ ہنگامی دور گذر گیا۔ پاکستان حاصل ہو گیا۔ اب بار بار اس کے تذکرہ سے کیا حاصل، بالخصوص مولانا آزاد یا مولانا مدنی وغیرہ علماء کرام کی مخالفت کا تذکرہ بے مقصد اور لاحاصل ہے۔ ان حضرات کے علم و فضل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کو جس رنگ میں پیش کیا جاتا ہے وہ بھی غلط ہے۔ اس زمانے میں اصل مقصد انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ کانگرسی علماء اس مقصد کے حصول کے لئے ایک طریقِ کار کو بہتر خیال کرتے تھے، مسلم لیگی زعماء دوسرے طریقِ کار کو۔ یہ فرق صرف طریقِ کار کا تھا۔ اصل مقصد کا نہیں تھا۔ لہٰذا طریقِ کار کے اختلاف پر اس قدر شدید مخالفت کیوں، اور اب اس داستانِ پارینہ کے دہرانے سے فائدہ؟ اس کا نقصان یہ ہے کہ پاکستان میں بکثرت ایسے لوگ ہیں جن کے دل میں ان حضرات کا بے حد احترام ہے۔ طلوعِ اسلام میں جو کچھ ان کی مخالفت میں لکھا جاتا ہے، اس سے ان لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ لہٰذا اس سے احتراز لازم ہے۔

چونکہ اس قسم کے خیالات کا اظہار بالعموم ہوتا ہے اس لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ صحیح پوزیشن کی وضاحت کر دی جائے۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ اس لئے اب اسے دہرانے اور اس سلسلہ میں مخالفینِ تحریک کے تذکرہ سے کیا حاصل؟ اس کا سیدھا اور سادہ جواب یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی تاریخ تو بہرحال لکھی جائے گی اور اس میں اس تحریک کے موافقین اور مخالفین دونوں کا تذکرہ ناگزیر ہوگا۔ لہٰذا اگر اس ضمن میں طلوعِ اسلام میں ان مخالفین کا ذکر آ جاتا ہے تو اس پر چیں بجبیں ہونے کی کیا بات ہے؟ اگر ان حضرات کی طرف کوئی غلط بات منسوب کی جاتی ہے تو وہ تو قابلِ اعتراض ضرور ہوگی۔ لیکن صحیح تاریخی واقعات کا تذکرہ کس طرح قابلِ اعتراض قرار پا سکتا ہے؟

(۲) لیکن طلوعِ اسلام میں اس داستان کو محض تاریخی حیثیت سے نہیں دہرایا جاتا۔ اس کا مقصد اس سے کہیں گہرا اور اہم ہے جسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ کہنا غلط فہمی یا مغالطہ آفرینی پر مبنی ہے کہ تحریکِ آزادیٔ ہند میں مقصود بالذات انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس کے لئے کانگریسی علماء کے نزدیک طریقِ کار ایک قسم کا تھا مسلم لیگی حضرات کے نزدیک دوسری قسم کا۔ لہٰذا ان دونوں میں فرق صرف طریقِ کار کا تھا۔

ہندوؤں کے نزدیک بے شک اس تحریک کا مقصد انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے ہاں کی مختلف جماعتوں میں طریقِ کار کا فرق تھا ـــــ بھگت سنگھ وغیرہم کا طریق تشدد کا تھا۔ گاندھی کا اہمسا کا ـــ لہٰذا (ان کے نزدیک) یہ دونوں محبِ وطن تھے۔ لیکن علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ (یعنی مسلم لیگی حضرات) کے نزدیک، انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا مقصود بالذات نہیں تھا۔ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ یا قدم اول تھا۔ اور یہی مسئلہ درحقیقت مابہ النزاع تھا۔ مولانا آزاد، مولانا حسین احمد اور اقبال + قائدِ اعظم کے مابین۔ اور یہ مابہ النزاع مسئلہ تھا اسلام کے بنیادی تصور کا ـــ مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد کا مسلک یہ تھا کہ:-

(۱)۔ ہندوستان کی چار دیواری کے اندر بسنے والے تمام لوگ، بلالحاظ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور اس قوم کی اپنی حکومت آزادی کہلائے گی۔

(۲)۔ کسی ملک کی حکومت کے اندر اگر مسلمانوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی آزادی حاصل ہو تو اس سے اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس اقبال اور قائدِ اعظم کا مسلک یہ تھا کہ:-

(۱)۔ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار، وطن کا اشتراک نہیں، ایمان کا اشتراک ہے۔ اس لئے مسلم اور غیر مسلم، مشترکہ طور پر ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ مسلمان اپنا جداگانہ قومی تشخص رکھتے ہیں۔

(۲)۔ اسلام، کسی حکومت کے اندر، نماز۔ روزہ وغیرہ کی آزادی کا نام نہیں۔ وہ اپنا مکمل ضابطۂ حیات رکھتا ہے اور جب تک اس پورے کے پورے ضابطۂ حیات پر عمل نہ ہو، مسلمان، اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ان کی اپنی آزاد مملکت لابدی ہے۔ تحریکِ پاکستان کا مقصد انگریز سے خلاصی حاصل کرنے کے بعد اس قسم کی آزاد مملکت کا قیام تھا۔

ان دونوں نظریات یا مسالک کا فرق، نہ تو (مروجہ اصطلاح کے مطابق) سیاسی تھا اور نہ ہی طریقِ کار کا فرق۔ یہ خالصتاً دینی یا قرآنی اور غیر قرآنی نظریات کا اختلاف تھا۔ نہ ہی یہ کوئی ہنگامی مسئلہ تھا جو حصولِ آزادی یا قیامِ پاکستان کے ساتھ ختم ہو گیا اور اب اس کی حیثیت محض "قصۂ پارینہ" کی ہے۔ اس کا تعلق اسلام کے ابدی، غیر متبدل، مسلمات سے ہے جو چودہ سو سال پہلے (بلکہ یوں کہیئے کہ اولین وحیٔ خداوندی کے زمانے میں) پیدا ہوا اور قیامت تک زندہ و پائندہ رہے گا۔ اسی کو حق و باطل کی کشمکش یا اسلامی اور غیر اسلامی نظریات کی آویزش کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ مسئلہ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے ابھرا، اور (مقامِ صد ہزار تاسف ہے کہ) اس میں مولانا آزاد، مولانا مدنی اور ان کے دیگر ہم نوا حضرات نے وہ مسلک اختیار کیا جو غیر اسلامی تھا۔ ان حضرات کا علم و فضل مسلّم، لیکن یہ چیز ان کے برسرِ حق ہونے کی سند قرار پا سکتی ہے اور نہ اس امر کی دلیل کہ ان کا مسلک غلط نہیں تھا۔ یہ دلیل کہ وہ حضرات اتنے بڑے عالمِ دین تھے اس لئے ان کا مسلک کس طرح غلط اور خلافِ اسلام ہو سکتا ہے۔ محض شخصیت پرستی

ہیں اور ان لوگوں کے نزدیک سند اور حجت جو اسلامی معیار کے مطابق غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کی خود استعداد اور صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے (یا کسی اور مصلحت کے پیشِ نظر) تقلید ان کا شیوہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ طلوعِ اسلام کا یہ مسلک نہیں۔ وہ، بتوفیقِ ایزدی، قرآنی بصیرت کے مطابق غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی کے مطابق اس نے، تحریکِ پاکستان کے دوران، کانگریسی علماء (بالخصوص مولانا آزاد اور مولانا مدنی) کے مسلک کی مخالفت کی۔ وہ اب، اس نزاع کی داستان کا دہرانا اس لئے ضروری سمجھتا ہے کہ:

(۱) خود تحریکِ پاکستان کے مؤیدین اس حقیقت کو فراموش کئے جا رہے ہیں کہ اس مطالبہ کی بنیاد کیا تھی۔

(۲) پاکستان میں جو حالات رونما ہو رہے ہیں، ان سے فائدہ اٹھا کر، مولانا آزاد اور مولانا مدنی کے معتقدین اس کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ حالات ثابت کر رہے ہیں کہ ان حضرات نے جو مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی مخالفت کی تھی تو وہ برسرِ حق تھے۔

طلوعِ اسلام اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے کہ وہ مؤیدینِ پاکستان کو بتائے کہ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے قیام کا مقصد کیا تھا اور جو حضرات (یہاں کے حالات کو بطور شہادت اور سند پیش کر کے) یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ کانگریسی علماء کی مخالفت حق بجانب تھی، ان پر یہ حقیقت واضح کرے کہ:

پاکستان کے حالات خراب ہونے سے وہ نظریہ باطل قرار نہیں پاتا جو اس مطالبہ کی بنیاد تھا۔ وہ نظریہ اسلام کی ابدی حقیقت ہے۔ وہ اس وقت بھی حقیقت تھا جب پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا۔ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا، تب بھی حقیقت رہتا۔ پاکستان کے حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں، وہ پھر بھی حقیقتِ ثابتہ رہے گا۔ اور اگر (خدانخواستہ۔ خاکم بدہن) پاکستان باقی نہ رہے، تو اس کے برحق ہونے میں پھر بھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس کے برعکس جو نظریہ، مولانا آزاد وغیرہم نے اختیار کیا تھا، وہ اس وقت بھی باطل تھا۔ آج بھی باطل ہے اور ہمیشہ باطل قرار پائے گا۔ اس لئے کہ وہ اسلام کے بنیادی مسلمات کے خلاف تھا۔

باقی رہا یہ کہ طلوعِ اسلام کو اس نزاع کی یاد دہانی اس لئے نہیں کرانی چاہیئے کہ اس سے ان حضرات کے معتقدین کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے تو اس کے جواب میں ہم صرف قرآن کریم کے اس ارشاد کا دہرا دینا کافی سمجھتے ہیں کہ:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ... (۲۳/۷۱)

"اگر حق لوگوں کے جذبات کے تابع ہو جائے تو سارا نظامِ کائنات تہس نہس ہو جائے۔"

مسلمانوں میں جو اس قدر غیر اسلامی (بلکہ خلافِ اسلام) نظریات و مسالک پا گئے ہیں تو اس لئے کہ اہلِ نظر نے حق کے مقابلہ میں لوگوں کے جذبات کے احترام کو ترجیح دی ــــ اور آج بھی یہ خلافِ اسلام نظریات و مسالک نہ صرف عام ہو رہے ہیں، بلکہ فروغ پا رہے ہیں۔ تو یہ بھی اس لئے کہ جاننے والے، یہ جاننے کے باوجود کہ یہ نظریات و مسالک غلط اور خلافِ اسلام ہیں، اب کشمکش کی جرأت نہیں کرتے۔ طلوعِ اسلام نے یہ مسلک اختیار کر کے جس قدر نقصان اٹھایا ہے اور اٹھا رہا ہے، اس کا اسے پورا پورا احساس اور اندازہ ہے۔ (اور یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں) نہ ہی وہ اس سے بے خبر ہے کہ وہ عوام کے جذبات کا احترام کر کے کس قدر مفادات حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے نہ ایسا کیا ہے، نہ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ

میزانِ خداوندی میں کتمانِ حقیقت کس قدر سنگین جرم ہے، اور اس کی پاداش کیا؟

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے، باطل کے نظریات کی حمایت کرنے والوں کی مخالفت میں کبھی بازاری انداز اختیار نہیں کیا۔ وہ نہ کبھی بدتمیزی پر اترا ہے، نہ اترے گا ـــــ اور یہی قرآن کریم کی تعلیم ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد کے متعلق یہ کہنا کہ ان کا مسلک غلط تھا، ان کی تحقیر ہے، تو اس کے لئے ہم مجبور ہیں ..... ہم جھوٹ کو سچ کہہ کر کسی کی (جھوٹی) عزت کرنے کو منافقت سمجھتے ہیں۔

(بقیہ ـــــ نقد و نظر)

میں سے چار ایسے بزرگوں کو دیکھا ہے جو اپنی قبروں میں بھی تصرف کرتے ہیں۔ ان کا یہ تصرف ان کی زندگی کی حالت سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ ایک خواجہ معروف کرخی رضی اللہ عنہ (کذا) اور دوسرے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔ دوسرے دو بزرگوں کے نام بھی بتائے گئے۔" (صفحہ ۱۸۴)

یہاں تک کہ:

"روح اعلیٰ علیین میں ہوتی ہے اور بہشت میں چرتی پھرتی ہے۔ جہاں چاہتی ہے۔ اور قبر کے پاس سلام کہنے والے کے سلام کو سن لیتی ہے اور نزدیک ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سلام کا جواب دیتی ہے۔ روح کی شان، بدن کی شان سے نرالی ہے۔" (صفحہ ۱۵۹)

یہ سب قرآن حکیم کے خلاف ہے، جو کہتا ہے کہ:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ..... وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ (۳۵/۲۲)

مردہ اور زندہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے ..... اور تم ان کو جو قبروں میں مدفون ہیں سنا نہیں سکتے۔

یہ ہے نمونہ اس لٹریچر کا جسے آج کل عام کیا جا رہا ہے۔ اب سوچئے کہ یہ اسلام کے خلاف کتنی بڑی خطرناک سازش ہے! کس قدر صحیح کہا تھا اقبالؒ نے کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری ۔۔۔ اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری!

لاہور میں قیام کے لئے
پارک وے ہوٹل
PARK WAY
فون ۵۷۲۵۹
صاف ستھرے ہوادار کمرے مناسب نرخ پر
نیز
عمدہ۔ لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لئے
معیاری طعام گاہ
آپ کی تشریف آوری کا شکریہ
منیجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن لاہور

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

اِنسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟

عمدہ سفید کاغذ قیمت ... روپے

لغات القرآن

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

جہانِ فردا

اسلام کیا ہے؟

معلومات افزا کتابیں